Registered No. L. 4186

جلد ۲۹ | صفر ۱۳۶۵
عدد ۵

<۸۶>

ماهنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
دارالاسلام جمال پور۔ پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے | قیمت فی پرچہ ۸/

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کیگئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت وضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیتِ اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعتِ اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیرِ طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (۲/۸) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ [illegible]

فہرست مضامین

۱۹۴۶ء

جلد۲۹	ذی القعدہ ۱۳۶۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۶ء	عدد۵

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر وپبلشر نے مرکنٹائل پریس، چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھان کوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہر دعوت حق کو عموماً تین طرح کے مخالفین اور تین قسم کے موافقین سے سابقہ پڑتا ہے۔ مخالفین کی قسمیں یہ ہیں :۔

— معاندین۔

— متربصین۔

— متغفلین۔

موافقین کے اقسام یہ ہیں :۔

— سابقین اولین۔

— متبعین باحسان۔

— ضعفاء اور منافقین۔

ان میں سے ہر گروہ کی خصوصیات وصفات اور ان کی نفسیات الگ الگ ہیں اس وجہ سے ایک حکیم داعی کو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بالکل علٰحدہ علٰحدہ معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بہت بڑی حد تک دعوت کی کامیابی کا انحصار اسی فرق معاملہ پر ہے۔ اگر ایک داعی ان مختلف جماعتوں کو امتیاز کرنے اور ان کے مخصوص محرکات ومیلانات کے پہچاننے سے قاصر رہ جائے تو اس کی دعوت کا کامیابی سے ہم کنار ہونا مشکل ہے۔ مسئلہ کی اس اہمیت کی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام جماعتوں کی امتیازی خصوصیات اور ان کے ذہنی میلانات کی تشریح کریں۔

۱۔ معاندین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت کے اثر کا اندازہ کرتے ہی اس کی مخالفت کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آتا ہے۔ ان کی مخالفت کی تہ میں یوں تو مختلف قسم کے محرکات کام کرتے ہیں لیکن تین محرک اصلی اور بنیادی ہیں۔ ایک حمیت جاہلیت، دوسرا استکبار اور حسد، تیسرا مفاد پرستی۔ یہ تینوں محرکات حق کی مخالفت میں پیش قدمی کے اعتبار سے تو بالکل یکساں نوعیت کے ہیں لیکن اپنی روح کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں

—— حمیت جاہلیت کی بیماری درحقیقت نظام جاہلی کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا نتیجہ ہے۔ اس بیماری میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے نظام جاہلی کے مخلص اور وفادار خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت ایسی اٹھ رہی ہے جو اس نظام کو جس کے وہ علمبردار ہیں، توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام برپا کرنا چاہتی ہے تو ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ ان کو اس میں اپنی قوم کی سیاسی و معاشی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے ان کے قبیلہ میں پھوٹ پڑ رہی ہے اور ان کی بنی بنائی جمعیت منتشر ہو رہی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت باپ دادا کے معروف طریقہ اور پرانی روایات کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ان کا دل اس سے کڑھتا ہے۔ یہ ساری باتیں مل ملا کر ان کے اندر داعی اور دعوت کے خلاف ایک سخت قسم کا غم و غصہ پیدا کر دیتی ہیں اور وہ پورے جوش کے ساتھ اس کی مخالفت میں لڑنے اور مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کی یہ مخالفت بیشتر قومی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں کمینہ پن اور ذلالت کا شائبہ کم ہوتا ہے۔ یہ ایک مردانہ مخالفت ہوتی ہے جس میں جوش تو ہوتا ہے لیکن یہ جوش شرافت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مخالفت میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد یہ عداوت محبت سے بدل جائے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ محبت بھی ویسی ہی پرجوش اور طاقتور ہوتی ہے جیسی پرجوش اور طاقتور عداوت تھی۔ اسلامی کی تاریخ میں اس کی بہترین مثال ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے۔ ابوجہل دعوت اسلام کی مخالفت میں آخر دم تک جس درجہ سرگرم رہا ہر شخص کو معلوم ہے، لیکن اس شدید عناد کے باوجود اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی رکیک الزام لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب آپ دعوت کے لیے نکلتے تو جوش مخالفت میں سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا کہ کوئی آپ کی بات سننے نہ پائے، لیکن جب

مخالفت میں تقریر کرتا تو اس کا انداز یہ ہوتا کہ "اے محمد، میں تو یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو لیکن تمہاری دعوت باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے۔" اس کو سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ اسلامی دعوت قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہی ہے اور آنحضرت صلعم پر سب سے بڑا الزام جو وہ لگاتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ نے بیٹے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر کے ان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ چنانچہ بدر کے معرکہ کے موقع پر جب اس نے دیکھا کہ اسلامی دعوت نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو اس نے پورے جوش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی۔ اللھم اقطعنا للرحم، وآتانا بما لا یعرف فاحنہ الغداۃ۔ (اے خدا ہم میں جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دیجیو)۔ یہ دعا اگرچہ حمیت جاہلیت کے زہر میں بجھی ہوئی ہے لیکن اس میں ابوجہل کی شرافتِ نفس اور قوم پرستی کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے مخالفین اگرچہ دعوت کی مخالفت میں کتنے ہی سرگرم ہوں، اپنے اندر ایک جوہر قوم پرستی کا رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک داعی حق کی نظروں میں ان کی ایک خاص وقعت ہوتی ہے اور وہ اس بات کا دل سے آرزومند ہوتا ہے کہ ان کا یہ جوہر باطل کی جگہ حق کی خدمت میں استعمال ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلامی کے تمام مخالفین میں سے خصوصیت کے ساتھ ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے لیے دعا کی تاکہ ان کے قبول اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت و عزت حاصل ہو۔ آپ کی یہ دعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں قبول ہوئی اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کے اسلام لاتے ہی دفعۃً حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ قبول اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ جس جوش، جس سرگرمی اور جس ہمت و حمیت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر رہے تھے اسلام لانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اولوالعزمی اور مردانگی کے ساتھ اسلام کے لیے جاں نثاریاں کرنے لگے۔ ان کی جاہلی حمیت کے اسلامی رنگ اختیار کرتے ہی دوست دشمن ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب اسلام کی صف میں ایک شیر دل مرد حق آ گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی سیرت کے اندر وہ جوہر موجود تھا جو انسان کی تمام اعلیٰ صفات کے لیے خمیر کا کام دے سکتا ہے لیکن یہ جوہر بہت سے جاہلی تصورات کے نیچے دبا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کی رگڑ

سے جب ان باطل تصورات کا میل اتر گیا تو نیچے سے وہ کھرا سونا صاف نکل آیا جس کی چمک نے بالآخر دنیا کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ اپنے عہد کے نظام جاہلی کے ساتھ حضرت عمرؓ کی وابستگی خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ نہیں تھی بلکہ اسلام لانے سے پہلے اسی نظام باطل کو وہ حق سمجھتے تھے۔ اسی کو اپنے مقدس باپ دادا کا ورثہ خیال کرتے تھے، اسی کے اندر اپنی قومی عزت کا بقا سمجھتے تھے اور ان تمام وجوہ سے وہ اپنا یہ دینی اور قومی فرض سمجھتے تھے کہ اس کے بہی خواہوں کے بہی خواہ اور اس کے مخالفوں کے دشمن ہوں لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے تو اسی جذبہ نے، جو ان کو نظام جاہلی کا پرجوش خادم بنائے ہوئے تھا، ان کو اسلام کی خدمت واعانت کے لیے سرگرم کر دیا۔ اس طرح کی سیرت رکھنے والے اشخاص ادنیٰ درجہ کی خود غرضیوں سے بالاتر ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کے انکار پر اڑتے اور نہ کسی چیز کو اختیار کر لینے کے بعد اس کے واجبی حقوق اور مطالبات ادا کرنے سے جی چراتے بلکہ ایک امر کے حق ثابت ہو جانے کے بعد اس کو قبول کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے اپنے ہر طرح کے ذاتی مفاد قربان بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں اپنا ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں مختلف ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کی حمیت اپنے حدود سے گذر کر انانیت اور خود پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ان کو آخر دم تک جاہلیت کے پھندے سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا جیسے ابوجہل۔ بعض تھوڑی سی کشمکش کے بعد کسی معمولی تنبیہ سے متنبہ ہو کر راہ حق پا لیتے ہیں جیسے حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما۔ بعض جاہلیت کے غلاف سے نکلنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں جیسے ابوسفیانؓ۔ لیکن ایک وصف ان سب میں مشترک ہوتا ہے وہ یہ کہ جب یہ جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں تو آتے ہی اسلام کی صف اول میں اپنی جگہ اسی طرح بنا لیتے ہیں جس طرح کل تک جاہلیت کی صف اول میں تھے۔ خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الاسلام۔

استکبار و حسد کی وجہ سے دعوت حق کی مخالفت بالعموم وہ لوگ کرتے ہیں جو روایتی دینداری اور

موروثی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انھیں عار محسوس ہوتا ہے اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں۔ موروثی دینداروں کی ذہنیت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو اپنے باپ دادا کی میراث اور اپنی ذاتی جائداد خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور عقیدت و احترام کے ماحول میں پلنے اور بڑھنے کی وجہ سے وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حق ان کی ذات یا ان کے حلقہ سے باہر بھی پایا جا سکتا ہے۔ موروثی مالداروں کا حال یہ ہے کہ وہ دنیوی شان و عظمت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھیرا لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ جب انھیں عزت و عظمت حاصل ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ انہی کا فکر اور انہی کا عمل حق بھی ہے۔ اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دینداری کے خلاف ہوتی ہے یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے تو یہ تلملا کے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت و شدید ہو جاتی ہے جب یہ دعوت ان کے حلقے کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوئی ہو۔ یہ لوگ اس غرور میں مبتلا ہوتے ہیں کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ہمیشہ ہمارے ہی ساتھ رہے گا۔ اور اگر بالفرض ہمارے اندر سے غائب بھی ہو جائے تو جب کبھی بھی اس کو دنیا پر ظاہر ہونا ہے ہمارے ہی واسطہ سے ظاہر ہوگا۔ اس غرور کے ساتھ ظاہر ہے کہ کسی ایسے حق کا قبول کرنا ان لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے جس کے داعی وہ خود نہ ہوں۔ چنانچہ دعوتِ حق کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا رہے ہیں ان کو حق پر ایمان لانے کی بہت کم ہی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ مکہ اور طائف کے وہ سردار جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر کوئی نبی بھیجنا ہی ہوتا تو وہ ہمارے اندر سے کسی کو بھیجتا، اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہی لوگ تھے جو اسلام کے حق اور اس کے ایک نعمتِ الٰہی ہونے کے اس بنا پر منکر تھے کہ اگر یہ حق اور اللہ کا اتارا ہوا دین ہوتا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم سے پہلے یہ رذیل اور فاقہ مست لوگ اس کو پاتے انہی لوگوں کے ساتھ یہود بھی شریک تھے جن کی اسلام کے ساتھ ساری عداوت و مخالفت کی تہ میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ اس حق کو مان لیتے ہیں تو ان کی دینی پیشوائی کی ساری عزت و فضیلت خاک میں

مل جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ اگرچہ بعض اعتراضات و شبہات بھی دعوت حق کے خلاف پیش کرتے ہیں تاکہ اپنی مخالفت کو جائز اور معقول ثابت کرسکیں لیکن حقیقت میں یہ سارے اعتراضات و شبہات محض اصل محرک مخالفت ـــ استکبار و حسد ـــ پر پردہ ڈالنے کے لیے گڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے مخالفین ایک داعی حق کے لیے اپنے اندر امید سے زیادہ مایوسی کا پہلو رکھتے ہیں۔ ان میں بہت تھوڑے نکلتے ہیں جن کو قبول حق کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ یہ اپنے استکبار کی وجہ سے اپنے آپ کو الوہیت کے منصب پر سرفراز کرلیتے ہیں اور اس منصب کو چھوڑنا اس وقت تک گوارا نہیں کرتے جب تک اس کو چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیے جائیں۔ قرآن مجید میں استکبار کو قبول حق کے سب سے بڑے موانع میں سے شمار کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے جگہ جگہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے زیادہ وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو دنیوی مال و متاع کی فراوانی یا مذہبی و دنیوی ریاست کی وجہ سے اپنے غرور میں سرمست ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے غرور ہی کے بنا پر فرمایا تھا کہ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔ نیز فرمایا تھا کہ "اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا آسان ہے مگر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا"۔ بعد کے واقعات نے اس پیشنگوئی کی پوری پوری تصدیق کردی۔ انجیل اور قرآن مجید دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پر یروشلم کے علماء اور فقہاء میں سے ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا یہاں تک کہ ان سے مایوس ہو کر حضرت کو دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی پڑی اور انہی کے اندر سے اللہ کے کچھ بندے ان کو ایسے ملے جنھوں نے دعوت حق کے اس کام کو سنبھالا۔ کم و بیش یہی صورت حال اس وقت پیش آئی جب آنحضرت صلعم کی دعوت بلند ہوئی۔ اہل کتاب کے پیشوایان دینی میں سے صرف گنتی کے چند نفوس اسلام لائے بقیہ سارے کے سارے اپنی پیشوائی اور مشیخت کے غرور میں حق کی مخالفت پر اڑے رہے۔ جو لوگ ایمان لائے ان کی صفات جہاں قرآن نے گنائی ہیں وہاں ان کی سب سے نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (اور وہ گھمنڈ نہیں رکھتے)۔ جس معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں کو مذہبی اور دنیوی ریاست

کا کوئی روگ نہیں لگا تھا اور وہ اپنے آپ کو حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ اس گروہ کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ شروع شروع میں یہ اپنے استکبار کی وجہ سے دعوت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا لیکن جب دعوت بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے اور ان کو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی نظر آتی ہے تو ان پر حسد کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت وہ داعی اور دعوت کی مخالفت میں وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں جو ایک مبتلائے حسد گروہ کر سکتا ہے۔

مفاد پرستی کی وجہ سے دعوت حق کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جن کا اخلاقی تصور حُبِّ ذات سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کا سارا اخلاقی و اجتماعی فلسفہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے اور پھر برابر اسی محور پر گھومتا رہتا ہے۔ یہ محض انسان کی اس فطری مجبوری کی وجہ سے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، جو تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا، کسی اجتماعی نظام کے اندر شامل تو ہوتے ہیں لیکن اس کے اندر ہر قدم پر صرف استحقاق تلاش کرتے ہیں، کسی جگہ بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک حق اور باطل کا معیار ان کی اپنی ذات ہے۔ جس چیز سے ان کی ذات کا بھلا ہو وہ حق ہے، اور جس چیز سے ان کے کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس لگ رہی ہو وہ باطل ہے۔ جن لوگوں کا اخلاقی و اجتماعی تصور اتنا پست ہو وہ لازماً ہر اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں جس سے ان کی مفاد پرستی کا یہ گھنونا پن دوسروں کے یا خود ان کے سامنے واضح ہو رہا ہو۔ اس طرح کے لوگ ان تمام جوہری صفات سے بالکل عاری ہوتے ہیں جن سے ایک اعلیٰ سیرت کی تشکیل ہوتی ہے اس وجہ سے کسی نظامِ حق کے لیے ان کا وجود فطری طور پر ویسا ہی نکما ہے جس طرح ایک عنین کا وجود ایک عورت کے لیے۔ یہ اپنی طبعی پستیٔ اخلاق اور دنائت کی وجہ سے کسی فاسد دعوت اور فاسد نظام ہی کی طرف میلان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی ان کی وابستگی بالکل منافقانہ اور خود غرضانہ ہی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ ایک چوٹ بھی کھانے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ابولہب کا وجود ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے سارا اختلاف محض اس وجہ سے تھا کہ آپ کی دعوت سے اس کی سیرت

کے تمام بدنما پہلو لوگوں کے سامنے آ رہے تھے اور اپنی خود غرضی اور زر پرستی سے اس نے جو دولت اکٹھی کر رکھی تھی وہ سب معرض خطر میں تھی۔ یوں تو وہ قریش کے قائم کردہ نظام جاہلی میں سب سے اونچے عہدہ پر فائز تھا لیکن اس نظام کے ساتھ اس کی ساری وابستگی محض اس وجہ سے تھی کہ منصب رفادہ اور خانہ کعبہ کی کلید برداری کی وجہ سے اس کو مالی دستبرد کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اس سے آگے اس کو نہ تو اپنی قوم ہی سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس نظام ہی کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی تھی جس کا وہ سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں آگے آگے رہتا اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ یہ آباء و اجداد کے قائم کردہ نظام کو برباد کرنے والی دعوت ہے لیکن بدر کے موقع پر جو قریش کے نقطۂ نظر سے ایک فیصلہ کن معرکہ تھا، اور جس میں ان کے تمام سردار پورے جوش دینی کے ساتھ شریک ہوئے، وراثت ابراہیمی کا یہ سب سے بڑا دعویدار گھر میں بیٹھا رہا اور کرایہ کے ایک آدمی کو اپنی طرف سے میدان میں لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح کے لوگوں کا ہر دعوت حق کے ساتھ فطری تعلق صرف مخالفت ہی کا ہو سکتا ہے اور مخالفت ہی کا ہوتا ہے۔ یہ دناءت اور رذالت میں اتنے پختہ اور مشاق ہو جاتے ہیں کہ کوئی دعوت جو مکارم اخلاق کی طرف بلا رہی ہو، جو ہمدردی، مساوات اور اخوت کا مطالبہ کر رہی ہو، جو ایثار، قربانی، اور جاں نثاری کے لیے پکار رہی ہو ان کو اپیل ہی نہیں کر سکتی۔ اس قسم کی دعوت کے لیے ان کے کان بہرے اور ان کے دل مردہ ہو چکے ہوتے ہیں، اور وہ نہ صرف یہ کہ اس کی طرف اپنے اندر کوئی میلان نہیں پاتے بلکہ اس سے نفرت اور کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی مخالفت بھی، ان کی اخلاقی پستی کی وجہ سے، نہایت رذیل اور کمینہ مخالفت ہوتی ہے۔ یہ علانیہ اور اصولی مخالفت کے بجائے بالعموم چغلی بدگوئی اور عیب جوئی پر اتر آتے ہیں اور ہمز و لمز کے ذریعہ سے اپنی لیڈری کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ متربصین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت حق کا حق ہونا تو کسی حد تک محسوس کر لیتا ہے لیکن نہ تو اس کے اندر اتنی اخلاقی قوت ہوتی کہ وہ حق کو مجرد اس بنا پر کہ وہ حق ہے قبول کر کے اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکے اور نہ عقلی اعتبار ہی سے یہ لوگ اتنے بلند ہوتے کہ نظام حق کے عملاً برپا ہونے سے پہلے کامیابی

کے ان امکانات کا اندازہ کر سکیں جو حق کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے یہ گروہ بجائے اس کے کہ کسی حق کے حق ہونے کا فیصلہ اپنی عقل سے کرے اس معاملہ کو مستقبل کے حوالہ کر کے انتظار کرتا ہے کہ اگر مستقبل نے اس کی کامیابی کا فیصلہ کر دیا تو اس کا ساتھ دیں گے ورنہ زندگی جس نہج پر گزر رہی ہے گزرتی جائے گی۔ یہ لوگ اپنی اخلاقی کمزوری اور عقلی ضعف کی وجہ سے ایک ذہنی کشمکش اور تردد و تذبذب کی حالت میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے دعوت حق کی مخالفت میں یہ بہت سرگرم تو نہیں ہوتے لیکن وقت کے نظام غالب کے اثر سے ساتھ مخالفین دعوت ہی کا دیتے ہیں اور حق و باطل کی کشمکش کے ہر مرحلہ میں زیادہ تر ان کی کوشش اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو جائے کہ حق و باطل دونوں ساتھ ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہ لوگ ایک بڑی حد تک منکرین حق کے گروہ میں وہی پوزیشن رکھتے ہیں جو موافقین حق کے گروہ میں منافقین کا ہوتا ہے اور اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے حق کی بڑی سے بڑی کامیابی کے بعد بھی ان کا تربص اور انتظار ختم نہیں ہوتا۔ ابتدائے دعوت اسلام میں جو لوگ اس طرح کی ذہنی حالت رکھنے والے تھے وہ بدر کے موقع پر یہ کہتے تھے کہ اگر اس معرکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو کامیابی ہوئی تو ہم مان لیں گے کہ انہی کی دعوت حق ہے اور اس کا ساتھ دیں گے لیکن جب یہ معرکہ سر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا تو انھوں نے اپنے معاملہ کا فیصلہ آئندہ لڑائیوں کے نتائج پر ملتوی کر دیا۔ ان جنگوں کا نتیجہ بھی جب قریش کے خلاف ہی نکلا اور عملاً قریش کی فوجی قوت ٹوٹ گئی تو اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں یہود کی منظم طاقت سے اسلام کا مقابلہ کیسا رہتا ہے؟ جب یہود کی طاقت بھی درہم برہم ہو گئی تو چاہیے تھا کہ ان کا انتظار ختم ہو جاتا لیکن اس کے بعد بھی ان کی ایک جماعت باقی رہی جو اس تصادم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگی جو رومیوں اور مسلمانوں میں برپا ہونے والا تھا۔ اس طرح یہ لوگ ایک غیر مختتم انتظار میں مبتلا رہے اور اس وقت تک ایمان نہیں لائے جب تک ان کے لیے کفر پر قائم رہنا ناممکن نہیں ہو گیا۔

اس گروہ کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ لوگ حق کو عقل سے پرکھ کر اس پر ایمان لانا نہیں چاہتے

بلکہ اس کے غلبہ کو آنکھوں سے دیکھ کر اس پر ایمان لانے کی خواہش رکھتے ہیں اور یہ خواہش بعینہ وہی خواہش ہے جس کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے ہوا ہے جو خدا پر ایمان لانے سے پہلے اس کو دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ یہ خواہش ایک طفلانہ خواہش ہے اور خدا اور اس کے رسول نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی ہے بلکہ صاف صاف یہ فرمایا ہے کہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو عقل سے سمجھ کر لایا جائے نہ کہ آنکھوں سے دیکھ کر۔ جو شخص ایک حق کو اس لیے حق مانتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج و ثمرات اس کے سامنے موجود ہیں یا اس کی مخالفت کے برے نتائج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ درحقیقت حق پر ایمان نہیں لایا ہے بلکہ وہ یا تو فوائد کی پوجا کر رہا ہے یا نقصانات کے ڈر سے سہما ہوا ہے۔ جو انسان ظاہر پرستی کے اس درجہ تک گر جاتا ہے اس میں اور ایک حیوان میں صرف صورت کا فرق رہ جاتا ہے اور اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں رہ کر کسی ایسے نظم اخلاق کا پابند رہ سکے جس کے نتائج آج نہیں بلکہ کل ظاہر ہونے والے ہیں۔ یہی راز ہے کہ اس ٹائپ کے لوگ داعیان حق کے نقطہ نظر سے کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتے۔ ان کی ذہنیت مقلدانہ ذہنیت ہوتی ہے۔ یہ چلتی گاڑی پر سوار ہونے کے عادی ہوتے ہیں خواہ وہ کسی سمت کو جا رہی ہو۔ یہ کفر کے ساتھی ہیں اس وجہ سے کہ کفر غالب ہے۔ اسلام کا بھی ساتھ دیں گے اگر اسلام غالب ہو جائے۔ ان کے اندر وہ مردان کار نہیں ہوتے جو حق کی طرف اپنی اندرونی کشش سے کھنچ کر آئیں بلکہ یہ طاقت کے دباؤ سے مجبور ہو کر آتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے لوگوں سے جماعت کی قوت بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے۔ ابتدائے اسلام میں جو لوگ ایمان لائے تھے ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ ان میں کا ایک ایک شخص دس کافروں پر بھاری تھا لیکن جب ان مسلمانوں کے ساتھ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کا جم غفیر بھی شامل ہو گیا تو یہ قوت گھٹ کر صرف ایک اور دو کی نسبت رہ گئی۔

اپنے عقلی اور اخلاقی ضعف کی وجہ سے اس ذہنیت کے لوگ کبھی کسی دعوت حق پر اس دور میں ایمان نہیں لا سکتے جس دور میں وہ کشمکشوں اور آزمائشوں سے گذر رہی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ یہ اس کے حق میں چوری چھپے کوئی کلمہ خیر کہہ دیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے دل کے مخفی گوشوں میں اس کی کامیابی کی کوئی خواہش پیدا ہو جائے۔ یہ بھی متوقع ہے کہ

وہ ان لوگوں کو کچھ اچھا نہ سمجھیں جو دعوت کی مخالفت میں پیش پیش ہوں بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے لوگ کبھی دعوت حق کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ کر لیں۔ یہ ساری باتیں ممکن ہیں لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ لوگ اس بات کی ہمت کریں کہ ٹوٹے ہوئے تختوں کو جمع کریں، ان کو جوڑ کر کشتی بنائیں، اس کشتی کو منجدھار میں ڈال دیں اور باد مخالف سے لڑ کر اس کو ساحل مراد پر پہنچانے کی کوشش کریں۔ ان کی ذہنی حالت دعوت کے مختلف سازگار اور ناسازگار حالات کے لحاظ سے متغیر ضرور ہوتی رہتی ہے، کبھی دعوت کی کامیابی کے آثار دیکھ کر ان کے دلوں میں گدگدی پیدا ہوتی ہے کہ آگے بڑھ کر خود بھی چھلانگ لگا دیں، کبھی مشکلات و مصائب دیکھ کر بالکل سہم جاتے ہیں اور دعوت کو حماقت اور داعی کو بے تدبر اور مجنون قرار دینے لگتے ہیں لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ معاندین کے سے جوش کے ساتھ اس کی مخالفت اور بیخکنی پر آمادہ ہو جائیں یا کھلم کھلا اس پر ایمان لا کر اس کی حمایت و نصرت کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ یہ اس کی تباہی بھی چاہتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے خود انھیں کوئی خطرہ مول لینا پڑے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ کشتی کسی چٹان سے ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جائے، اسی طرح اگر اس کی کامیابی کی آرزو کرتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس راہ میں انھیں کوئی جوکھم برداشت کرنا پڑے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے اس کے لیے جان و مال کی قربانیاں کر کے اس کو پروان چڑھائیں اور یہ اس کا پھل کھائیں۔

۳۔ منفعلین سے مراد عامۃ الناس کی وہ بھیڑ ہے جن کو اپنی روٹی اور روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ سوسائٹی کے بناؤ اور بگاڑ کے کاموں میں قائدانہ حیثیت سے کوئی حصہ لے سکیں۔ یہ ذہنی اور معاشی دونوں اعتبار سے اپنے وقت کے نظام کے تابع بلکہ اس کے قلی ہوتے ہیں اور اس کے تحت جیتے رہنے ہی کو ایک بڑی نعمت اور ان لوگوں کا فضل و احسان سمجھتے ہیں جن کی قیادت میں یہ نظام چل رہا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ان اخلاقی مفاسد سے پاک ہوتے ہیں جن میں معاندین کا گروہ مبتلا ہوتا ہے اس وجہ سے کسی دعوت حق کی مخالفت میں سرگرمی کے ساتھ نہ یہ حصہ لیتے اور نہ ان کے حصہ لینے کی کوئی وجہ ہے لیکن یہ اپنے وقت کے دینی و سیاسی پیشواؤں کے مقلد اور مرید ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک موروثی حسن ظن رکھتے ہیں اس وجہ سے کوئی ایسی بات جو ان کے ائمہ سیاست و مذہب کے مسلک کے خلاف ہو ان کے دل کو اولاً تو لگتی

نہیں اور اگر لگتی بھی ہے تو شروع شروع میں وہ اس سے بیگانگی سی محسوس کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ان کے ائمہ قدم اٹھائیں تو یہ ان کے ساتھ چلیں۔ ان کے ائمہ ان اسباب کی وجہ سے جو اوپر بیان ہوئے، موافقت کے بجائے مخالفت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ اپنے اتباع کو بھی لے چلیں۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ یہ گروہ دعوت سے واقف ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ حق و باطل کی یہ کشمکش جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے عامۃ الناس اتنے ہی اس سے قریب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس کشمکش میں ان کو داعی کے بے لوث کیرکٹر اور اس کی دعوت کی دلپذیری کا بطور خود اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کے کچھ ذہین اور اخلاقی جرأت رکھنے والے اشخاص دعوت کے حامی بن جاتے ہیں۔ وقت کے ارباب اقتدار جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پیرو ان کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں تو وہ دعوت اور داعی کی مخالفت میں پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتر آتے ہیں اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے پروپگنڈے کے سارے حربے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ جہلا کو دعوت کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن اس دور میں ان لوگوں کو داعی کے اعلیٰ کیرکٹر اور اس کی دعوت کی عقلی قوت کا اپنے لیڈروں کے اخلاق اور ان کی دعوت کی قوت سے موازنہ کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ عوام اپنے سابق لیڈروں سے بدگمان اور نئی دعوت سے متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں اگرچہ دیرینہ تقلید کی بندشیں فوراً دور نہیں ہوتیں لیکن اس گروہ کے جری اور بلند سیرت اشخاص حق پرستی کی راہ کھول دیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس طبقہ کا ایک بڑا حصہ حق کے آغوش میں آ جاتا ہے۔

یہ دعوت حق کے مخالفین کی مختلف جماعتوں کی خصوصیات و رجحانات کی تشریح تھی۔ آئندہ صحبت میں ہم موافقین کی مختلف گروہوں کی نفسیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

روداد مجلس شوریٰ

منعقدہ بمقام دارالاسلام بتاریخ ۱۵، ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء

ازجناب طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی

اجتماع الہ آباد منعقدہ اپریل ۱۹۴۶ء کے موقع پر مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا تھا کہ آئندہ سالانہ اجتماع اور دوسرے مسائل پر غور کرنے کے لیے مجلس شوریٰ کا آئندہ اجلاس اگست ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام میں بلایا جائے لیکن رمضان کی وجہ سے یہ اجلاس اگست کے بجائے ۱۵، ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو بلائے جانے کا امیر جماعت نے فیصلہ کیا۔ اس اجلاس کی مفصل روداد درج ذیل ہے:۔

پہلا اجلاس

بتاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء بروز اتوار

حسب اعلانِ سابق مجلس شوریٰ کا اجلاس لائبریری کے کمرہ میں ٹھیک ۹ بجے شروع ہوا۔ امیر جماعت کے علاوہ حسب ذیل ارکان شریک تھے:

(۱) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، دارالاسلام۔
(۲) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، دارالعروبہ، جالندھر۔
(۳) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، ولتناکیم، نارتھ ارکاٹ، مدراس۔
(۴) مولانا عبدالغفار صاحب، موتی بازار، مالیرکوٹلہ۔
(۵) ملک نصراللہ خان صاحب عزیز، اڈیٹر کوثر، لاہور۔
(۶) جناب عبدالجبار صاحب غازی، دارالاسلام۔
(۷) سردار محمد اکبر صاحب، ارشد منزل، کیمبل پور۔
(۸) سید عبدالعزیز صاحب شرقی، نیلا محل، جالندھر۔
(۹) خان سردار علی خان صاحب، موضع سیرے ضلع مردان۔
(۱۰) جناب محمد یوسف صاحب صدیقی، محلہ قافلہ، ٹونک راج۔
(۱۱) چودھری شفیع احمد صاحب، تتلواڑہ ضلع بارہ بنکی (یوپی)
(۱۲) میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت۔

قاضی حمید اللہ صاحب سیالکوٹی اپنی اہلیہ کی شدید بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔

حسب ذیل امور مجلس کے سامنے غور و بحث کے لیے پیش ہوئے:

(۱) آئندہ سالانہ اجتماعات کا مسئلہ۔

(۲) بیت المال کی تنظیم، مقامی اور مرکزی بیت المال کا دستور، آمد و خرچ کے متعلق ضروری ہدایات، خازن اور محتسب (Auditor) کا انتخاب۔

(۳) ہندوستان کے موجودہ حالات میں جماعت کی پالیسی۔

(۴) رسالہ ترجمان القرآن کا مسئلہ۔

(۵) تربیت گاہ کے پروگرام پر تبصرہ۔

(۶) امیر جماعت کی عدم موجودگی میں جماعت کے نظم کا معاملہ۔

(۷) حکومت کی روز افزوں اجتماعی تصرف ( ) کی پالیسی کو دیکھتے ہوئے افراد جماعت کے لیے ایک معاشی لائحہ عمل تجویز کرنے کا معاملہ۔

(۸) جماعت کو خطاب عام کے لیے تیار کرنے کا ابتدائی پروگرام۔

(۹) بیرونی مقامات پر ضمنی مراکز بنیں تو وہاں آبادکاری کے لیے کیا قواعد ہوں؟

(۱۰) جماعت کے ہمدردوں اور متاثرین کی تنظیم کا مسئلہ۔

(۱۱) مسئلہ عشر کا فیصلہ

ان مسائل پر مجلس شوریٰ میں بالاتفاق حسب ذیل امور طے کیے گئے:

۱۔ آئندہ سالانہ اجتماعات کا مسئلہ۔

۱۔ اجتماع عام کی شکل | اس بارے میں مجلس شوریٰ کے سامنے جو مختلف شکلیں تھیں انھیں رسالہ ترجمان القرآن بابتہ جمادی الثانی ۶۵ھ میں شائع کر کے ارکان جماعت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے مشوروں اور دلائل سے ہمیں مطلع کریں کہ ان مختلف شکلوں میں سے کونسی شکل ان کی رائے میں موزوں تر ہے، نیز یہ کہ اگر مذکورہ شکلوں کے علاوہ کوئی اور شکل بھی کسی کے سامنے ہو تو وہ بھی پیش کر دی جائے۔ بہت سے ارکان اور جماعتوں نے مشورے بھیجے تھے جن کو مرتب کر کے مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مجلس نے ہر

تجویز کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ آخر کار امیر جماعت نے ارکان شوریٰ کے اتفاق سے آئندہ سالانہ اجتماعات کی حسب ذیل صورت تجویز کی:

(۱) سالانہ اجتماعات کی غرض کے لیے ہندوستان کو مندرجہ ذیل چار حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(i) شمالی ہندوستان یعنی پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور دہلی۔

(ii) مشرقی ہندوستان یعنی یوپی، بہار، اڑیسہ، بنگال اور آسام۔

(iii) مغربی و وسطی ہندوستان، یعنی راجپوتانہ، مالوہ، بمبئی، سی پی، اور برار۔

(iiii) جنوبی ہندوستان، یعنی مدراس، میسور اور حیدر آباد

۲۔ ان میں سے ہر حلقے کا اجتماع ہر سال منعقد کیا جائے، اس اجتماع میں حلقۂ متعلقہ کے تمام ارکان کی شرکت لازم ہو الا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔

۳۔ جماعت کا اجتماع عام بھی ہر سال منعقد کیا جاتا رہے، مگر اسے مذکورہ حلقہ وار اجتماعات میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا کر منعقد کر لیا جائے۔

۴۔ جس حلقہ وار اجتماع کے ساتھ جماعت کا اجتماع عام منعقد کیا جا رہا ہو اس میں حلقۂ متعلقہ کے تو تمام ارکان کو لازماً شریک ہونا پڑے گا۔ (الا یہ کہ انھیں کوئی عذر شرعی مانع ہو) مگر دوسرے حلقوں کے صرف قیم صاحبان، مقامی جماعتوں کے امرا، اور جہاں مقامی جماعت میں دس یا دس سے زائد ارکان موجود ہوں وہاں سے مقامی امیر کے علاوہ ہر دس ارکان میں سے ایک منتخب نمائندہ کی شرکت ضروری ہوگی۔ باقی ارکان کے لیے اجتماع عام کی حاضری لازم نہیں بلکہ اختیاری ہوگی۔

۵۔ اجتماع عام کے اعلان کے ساتھ وہ ضروری ہدایات بھی شائع کر دی جایا کریں گی جنھیں شرکائے اجتماع کو سفر و اجتماع گاہ میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ نیز ہمدرد حضرات سے بھی مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ ہمارے اجتماعات میں ہمارے نظم کی ویسی ہی پابندی کریں جیسی ارکان جماعت کرتے ہیں۔

ب۔ اجتماع عام کا پروگرام | ۱۔ اجتماع عام سے ایک روز قبل مجلس شوریٰ کا اجلاس کر کے اجتماع کا پروگرام اور دوسرے ضروری مسائل طے کر لیے جایا کریں۔

۲- اجتماع کا پروگرام حسب دستور سابق تین دن کا رہے گا اور اجتماع کو دو قسم کے اجلاسوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۱) اجلاس عام جس میں ارکان اور ہمدرد اور عام زائرین، سب شریک ہوں۔

(۲) اجلاس خاص جس میں صرف ارکان جماعت ہی شریک ہوں۔

۳- اجلاسوں کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:-

پہلا دن: (۱) صبح .... اجلاس عام

(۲) سہ پہر .... اجلاس خاص

دوسرا دن: (۱) صبح .... اجلاس عام

(۲) سہ پہر .... اجلاس عام

تیسرا دن: (۱) صبح .... اجلاس خاص

(۲) سہ پہر .... اجلاس خاص

(۳) رات .... جلسۂ عام

جلسۂ عام میں اپنی دعوت کو تمام لوگوں کے سامنے بلا تمیز مذہب و ملت پیش کیا جائے گا۔

۴- اجتماع کے بعد اگر ضرورت محسوس ہو تو ارکان مجلس شوریٰ کو ایک روز ٹھیرا کر شوریٰ کا اجلاس کر لیا جائے گا تاکہ اجتماع کے دوران میں جو امور قابل غور سامنے آئے ہوں اس پر غور و فکر کر لیا جائے۔

۵- اجتماع عام میں قیم جماعت کی رپورٹ کے علاوہ صرف اس حلقے کے قیم صاحبان کی رپورٹیں پیش ہوں گی جس میں اجتماع عام منعقد کیا گیا ہو۔

۶- جماعت کے جو لوگ اپنی دعوت کو تحریر یا تقریر کے ذریعہ پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں ان کے لیے اجتماع عام سے پہلے خود ان کے مشورے سے مضامین اور عنوان تجویز کر دیے جائیں گے اور وہ اجتماع کے موقع پر اپنے مقالات اور تقریروں کے ذریعہ جماعت کی دعوت کو مختلف پہلوؤں سے پیش کریں گے۔

۷۔ حلقہ وار اجتماعات کا پروگرام بھی حتی الامکان وہی ہوگا جو اجتماعِ عام کے لیے اوپر تجویز کیا گیا ہے۔ نیز ان اجتماعات میں بھی صرف حلقۂ متعلقہ کے قیم صاحبان ہی اپنی سالانہ رپورٹیں پیش کریں گے۔

۲۔ بیت المال کی تنظیم

مرکزی اور مقامی بیت المال چونکہ اب کافی ترقی کر گئے ہیں اس لیے اب ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کا ایک ضابطہ مقرر کر دیا جائے، چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے حسبِ ذیل ضابطہ پر اتفاق کیا:۔

مرکزی بیت المال ۱۔ مرکزی بیت المال امیرِ جماعت کے تحتِ امر ہوگا، اس کے لیے ایک خازن اور ایک محاسب (اکاؤنٹنٹ) مقرر کیا جائے گا، اور حتی الامکان کوشش کی جائے گی کہ ایک سے زائد منصب ایک ذات میں جمع نہ ہوں۔

۲۔ مرکزی بیت المال کا محاسب صرف اسی بیت المال کا محاسب نہیں ہوگا بلکہ اس کا کام مقامی بیت المالوں کے حسابات کی جانچ کرنا اور ان کا ریکارڈ رکھنا بھی ہوگا۔

۳۔ مرکزی بیت المال کے حسابات کی جانچ ہر سال کے خاتمے پر کسی قابلِ اعتماد ماہرِ حسابات سے کرائی جاتی رہے گی۔

۴۔ ہر سال جماعت کے حسابات مجلسِ شوریٰ کے سامنے اور اگر ممکن ہو تو اجتماعِ عام میں پیش کیے جاتے رہیں گے اور ہر رکنِ جماعت کو ان پر تنقید کا حق ہوگا۔ نیز ہر رکنِ جماعت کو ہر وقت یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ جب چاہے مرکزی بیت المال کے حسابات کی جانچ کا مطالبہ کرے۔

۵۔ مرکزی بیت المال میں جتنی رقوم وصول ہوں گی ان کی باقاعدہ رسیدیں جاری کی جائیں گی اور یہ رسیدیں امیرِ جماعت یا ان کے نائب کے دستخط سے جاری ہوں گی۔ نیز بیت المال سے جو رقوم صرف ہوں ان کی بھی رسیدیں حاصل کرنے کا اہتمام کیا جائے گا، الا یہ کہ ایسا ہونا ممکن نہ ہو۔

۶۔ خازن اور محتسب (Auditor) کا انتخاب مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے کیا جائے گا۔

۷۔ بیت المال کے مصارف امیرِ جماعت کی منظوری سے ہوں گے اور امیرِ جماعت کو اختیار ہوگا کہ مرکز کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار کارکنوں کو جتنی رقم باختیارِ خود صرف کرنے کی اجازت مناسب سمجھے دے۔

۸۔ بیت المال اور اس کے مصارف کے لیے امیر جماعت پوری جماعت کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

نوٹ:۔ مجلس شوریٰ کے مشورے سے جناب محمد عبد الجبار صاحب غازی کو مرکزی بیت المال کا خازن اور جناب اے۔ آر صوفی صاحب کو محتسب (Auditor) منتخب کیا گیا۔

یہ انتخاب ایک سال کے لیے ہے۔

مقامی بیت المال

۱۔ ہر مقامی جماعت کا بیت المال مقامی امیر کے تحتِ امر ہوگا۔

۲۔ اگر عملاً ممکن ہو تو ہر مقامی جماعت کو اپنے ارکان میں سے ایک خازن اور ایک محاسب (اکاؤنٹنٹ) منتخب کرنا چاہیے اور اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ خازن اور محاسب کے منصب ایک شخص میں نہ جمع ہونے پائیں نیز خازن اور محاسب مقامی امیر جماعت کے علاوہ دوسرے لوگ ہوں۔

اگر کوئی مقامی جماعت اتنی مختصر ہو کہ یہ منصب الگ الگ نہ قائم کیے جاسکیں تو عارضی طور پر جو انتظام بھی ممکن ہو کر لیا جائے مگر جماعت کے بڑھ جانے کی صورت میں جلدی سے جلدی بیت المال کے انتظام کی مذکورہ بالا صورت اختیار کر لینی چاہیے۔

۳۔ بیت المال میں جو رقوم وصول ہوں ان کی باقاعدہ رسیدیں جاری کرنے کا انتظام ہونا چاہیے کوئی رقم ایسی نہ ہو جس کی رسید نہ جاری کی گئی ہو۔

۴۔ مقامی بیت المال کا ذمہ دار اگرچہ مقامی امیر ہوگا لیکن بیت المال کے مصارف کے سلسلے میں مقامی امیر کو حتی الامکان اپنی جماعت کے مشورے سے کام کرنا چاہیے اور اگر کسی موقع پر کسی ہنگامی ضرورت کے لیے مقامی امیر کوئی رقم صرف کرے تو وہ قریب کے ہفتہ وار اجتماع میں مقامی جماعت کے علم میں آجانی چاہیے۔

اگر کسی رقم کے صرف پر مقامی جماعت اعتراض کرے تو اس معاملے میں مرکز کی طرف رجوع کیا جائے۔

۵۔ ہر مقامی امیر کو بیت المال کے حسابات اپنی جماعت کے سامنے ماہوار پیش کرنے چاہئیں اور مقامی جماعت کو ان پر آزادانہ تبصرے کا موقع دینا چاہیے۔ نیز ہر رکن جماعت کو ہر وقت یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہے مقامی امیر سے بیت المال کے حساب جانچنے کا مطالبہ کرے۔

۶۔ ہر مقامی جماعت کو اپنے سہ ماہی حسابات پابندی سے مرکز میں بھیجنے چاہئیں اور یہ حسابات مقامی رپورٹوں میں نہ شامل کر دیے جائیں بلکہ الگ کاغذ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔

۷۔ اگر کسی مقامی بیت المال میں اتنی رقم جمع ہو جائے جو مقامی ضروریات سے زیادہ ہو تو یہ زاید رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی جایا کرے۔

(۱) یہ فیصلہ کرنا کہ مقامی ضروریات سے زاید رقم کیا ہے اور کتنی ہے مقامی جماعت ہی کا کام ہو گا جس کو وہ باہمی مشورے سے طے کرے گی۔

(ب) مرکز کو یہ حق ہو گا کہ اگر کسی وقت اس کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ مقامی جماعتوں سے مدد طلب کرے اور اس صورت میں مقامی جماعتوں کو بہت سی مقامی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بھی اپنے بیت المالوں سے مرکز کی امداد کرنی ہوگی۔

۸۔ اگر کسی مقامی جماعت کو اپنی ضروریات کے لیے مرکز سے مدد کی ضرورت ہو تو وہ اپنی ضروریات ظاہر کر کے امیر جماعت سے مدد کی درخواست کر سکتی ہے۔

۹۔ ایک مقامی بیت المال سے دوسرے مقامی بیت المال میں کوئی رقم مرکز کی منظوری کے بغیر نہیں جانی چاہیے۔

نوٹ:۔ رسید بکیں مرکز سے طبع کروا کر مقامی بیت المالوں میں بھیجی جائیں گی۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا۔

دوسرا اجلاس

مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس بعد نماز ظہر تین بجے سہ پہر شروع ہوا اور ایجنڈا کی شق نمبر ۳ سے کارروائی شروع ہوئی۔

۳۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جماعت کی پالیسی

اس مسئلے پر بہت طویل اور مفصل گفتگو اور غور و فکر کے بعد حسب ذیل امور طے کیے گئے:۔

۱۔ ہندوستان کے موجودہ حالات اور عام سیاسی فضا پر ایک مفصل اور مدلل اور مبنی بر انصاف بیان شائع کیا جائے کہ ہماری رائے میں یہ حالات اور یہ سیاسی فضا کس چیز کا نتیجہ ہے اور ایک حق پرست انسان کو

اس وقت کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بیان امیر جماعت مرتب کرکے شائع کریں گے۔

۲۔ موجودہ فرقہ وار کشمکش کے سلسلہ میں اگر عام مسلمان ہڑتالیں کریں تو موجودہ سیاسی جماعتوں میں سے کسی کے سیاسی احتجاج میں شرکت کی نیت سے نہیں بلکہ صرف شر سے بچنے کی نیت سے جماعت کے تاجر اور صنعت پیشہ ارکان بھی اپنی دکانیں بند کر دیا کریں۔ نیز جہاں شر کا اندیشہ ہو وہاں غیر مسلموں کی ہڑتالوں کے موقع پر بھی ایسا ہی عمل کیا جائے۔

۳۔ ہم سے سوال کیا گیا ہے کہ اگر مسلم لیگ اپنے ڈائریکٹ ایکشن کی پالیسی پر عمل درآمد کرے اور اس سلسلے میں مالیہ اور ٹیکس نہ دینے یا ملازمتیں ترک کرنے کے احکام عام مسلمانوں کو دے تو جماعت کا رویہ کیا ہوگا؟ اس معاملے میں عملاً جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ تو اس وقت دی جائیں گی جب فی الواقع ایسی کوئی صورت رونما ہوگی لیکن سردست ہم اصولی طور پر اپنی پالیسی واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

غیر اسلامی نظام حکومت کو غلط اور باطل اور فاسد اور اس سے تعاون کو حرام جاننے کی حد تک ہمارا جو مسلک ہے اس کو ہم بارہا واضح کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں اگر اس نظام حکومت سے کسی موقعہ پر عدم تعاون یا ترک تعلق کریں گی تو صرف ایک سیاسی تدبیر کے طور پر کریں گی نہ کہ ایک مستقل دینی عقیدے کی حیثیت سے۔ لیکن ہمارا تو قطعی اور مستقل دینی عقیدہ ہی یہی ہے کہ ہر وہ نظام حکومت باطل ہے جو خداوند عالم کی اطاعت، اور اس کے قانون شرعی کی پیروی پر مبنی نہیں ہے۔ رہا عملی طور پر اس سے عدم تعاون اور قطع تعلق، تو اس معاملہ میں ہمارے دستور جماعت کی رو سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ایسے کسی نظام حکومت کے ساتھ تعاون کی نیت سے تعاون کرنا حرام ہے اور مستقل طور پر حرام ہے نہ کہ کسی سیاسی شکایت کی بنا پر۔ اور ایسا تعلق جو اسلامی انقلاب کی جد و جہد کے لیے ناگزیر یا مددگار ہو حلال ہے بلکہ بعض صورتوں میں لازم بھی ہے، اور ایسا تعلق جو محض شخصی اضطرار کے طور پر کسی شخص کو رکھنا پڑے (مثلاً ملازمت، یا ٹیکس یا مالیہ دینا وغیرہ) مجبوراً صرف اس وقت تک گوارا کیا جا سکتا ہے جب تک کوئی شخص اس سے بچنے پر عملاً قادر نہ ہو اور ایسے تعلق سے اجتناب جب کبھی ہو حرام سے بچنے کی نیت سے ہونا چاہیے نہ کہ کسی قومی یا سیاسی شکایت پر احتجاج کی نیت سے۔ بہرحال اس معاملہ میں ہمارا اور سیاسی جماعتوں کا ساتھ کسی طرح نبھ نہیں سکتا۔

کیونکہ ہم حرام و حلال کے حدود شریعت سے لیتے ہیں اور یہ حدود مستقل ہیں، اور وہ ان امور کا فیصلہ سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر کرتے ہیں اس لیے ان کے ہاں ایک چیز آج حلال اور کل حرام اور پرسوں پھر حلال ہو جاتی ہے۔

۴۔ یہ سوال بھی کیا جا رہا ہے کہ اگر کہیں فسادات رونما ہوں تو ہم کیا رویہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں عام ہدایات اس سے پہلے ترجمان القرآن میں دی جا چکی ہیں۔ اب مجلس شوریٰ کافی غور و خوض کے بعد حسب ذیل ہدایات دیتی ہے:-

(۱) عام فساد کی حالت میں ارکان جماعت کے لیے اپنے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ان کا اپنا اخلاقی رویہ اور ان کا قومی و نسلی تعصبات سے بالاتر رہ کر خیر و صلاح کی عملاً دعوت دینا ہے۔ اس معاملے میں ارکان جماعت جتنے زیادہ راست رو اور بے شر ہوں گے، اور جس قدر زیادہ بھلائی کرنے اور بھلائی کی طرف دعوت دینے میں سرگرم ہوں گے اسی قدر زیادہ فتنہ عام کی آگ سے ان کا محفوظ رہنا متوقع ہے اور جس قدر زیادہ وہ بے عمل رہیں گے اسی قدر زیادہ خطرے میں رہیں گے۔

(۲) اگر فساد کی حالت میں کوئی رکن جماعت گھر جائے اور اس پر حملہ کیا جائے تو حتی الامکان اسے حملہ آوروں کو نصیحت کرنی چاہیے، اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو وہ اپنی مدافعت کے لیے ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ اس صورت میں اگر اس کے ہاتھ سے کوئی مارا جائے تو مقتول کے خون کی ذمہ داری شرعاً خود مقتول ہی پر ہوگی، مدافعت میں ہاتھ اٹھانے والا عند اللہ بری ہوگا، اور اگر مدافعت کرنے والا خود مارا جائے تو وہ انشاء اللہ شہید ہوگا۔

(۳) اگر کسی رکن جماعت کے سامنے ہندوؤں یا مسلمانوں کا کوئی گروہ کسی مظلوم پر دست درازی کر رہا ہو تو اس کو روکنے کی اور مظلوم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے حتیٰ کہ اس سلسلے میں خود اپنی جان بھی خطرے میں پڑ جائے تو اس خطرے کو انگیز کر لیا جائے۔

(۴) فساد کی حالت میں اگر کوئی شخص یا خاندان خطرے میں مبتلا ہو، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اور خواہ وہ خود پناہ مانگے یا نہ مانگے، اپنی طرف سے کوشش کر کے اسے اپنی پناہ میں لے لیا جائے اور اپنے آپ کو خطرے

میں ڈال کر بھی اس کی حفاظت کی جائے۔

(۵) فسادات کے زمانے میں جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملے عامۃ الناس کو اور اگر ممکن ہو تو فسادات بھڑکانے والے سرغنوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے، ان کو خدا سے ڈرایا جائے، اگر مسلمان ہوں تو ان کو دین کا حقیقی مقصد اور اس کے حصول کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر یہ واضح کیا جائے کہ یہ قومی کشمکش اور اس کے لیے یہ فساد کسی درجے میں بھی عند اللہ مقبول نہیں ہے، اور اگر غیر مسلم ہوں تو ان پر نیشنلزم کے برے نتائج واضح کیے جائیں۔

(۶) عام نوعیت کی معاشی ہڑتالیں اگر کہیں ہوں اور ہمارے ارکان جماعت ان کی لپیٹ میں آتے ہوں، تو انھیں کام چھوڑ دینے کی حد تک۔ تو ہڑتال میں حصہ لینا چاہیے مگر اس کے ساتھ اپنا مسلک بھی صاف واضح کر دینا چاہیے۔ ان کو کہنا چاہیے کہ ہم ہڑتال صرف جھگڑے سے بچنے کے لیے کر رہے ہیں ورنہ ہم دونوں فریقوں میں یہ یہ خرابیاں پاتے ہیں، ان کی فلاں فلاں باتیں حق و انصاف پر مبنی ہیں، فلاں فلاں باتیں حق و انصاف کے خلاف ہیں، اور ہماری جماعت معاشی انصاف اور اجتماعی عدل کے قیام کے لیے خود اپنا ایک مستقل نظریہ رکھتی ہے۔

(مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس شام کے پانچ بجے ختم ہوا۔)

تیسرا اجلاس

بتاریخ ۱۷؍ ستمبر ۱۹۴۶ء بروز منگل

[۱۶؍ ستمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس شوریٰ کا کوئی اجلاس منعقد نہیں ہوا کیونکہ تقریباً سب لوگ ابو العرفان صاحب مرحوم کی تجہیز و تکفین کے لیے ٹبری متصل گورداسپور چلے گئے تھے۔

مرحوم کی لاش کی واپسی کی اطلاع صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب بذریعہ ٹیلیفون دارالاسلام پہنچی اور اسی وقت سب لوگ ٹبری روانہ ہو گئے۔ مرحوم کو اسی روز عصر کے وقت موضع جیاوالے کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ قبرستان ٹبری سے بنگالہ نہر کے جنوب مشرق کی جانب کوئی ایک میل کے فاصلے پر لب سڑک واقع ہے]

مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس ۱۷؍ ستمبر کو صبح نو بجے شروع ہوا اور اس میں ایجنڈا کی شق نمبر ۴ سے

کارروائی کا آغاز ہوا۔

۴۔ ترجمان القرآن کی ملکیت کے انتقال کا مسئلہ

جون ۱۹۴۶ء میں امیر جماعت نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ رسالہ ترجمان القرآن کو بلا کسی معاوضہ کے جماعت کی ملکیت میں دے دینا چاہتے ہیں اور آئندہ اس رسالہ کی ادارت کا فریضہ بھی بلا معاوضہ انجام دیں گے اس موقع پر مجلس شوریٰ کے بعض ارکان نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ آئندہ مجلس شوریٰ کے اجتماع تک انتظار کریں۔ چنانچہ اب مجلس شوریٰ کے سامنے انھوں نے پھر اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا۔ مجلس نے اس معاملہ کے جملہ پہلوؤں پر غور کیا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ معاملہ مزید غور چاہتا ہے اس لیے اس کو سردست ملتوی کر دیا جائے۔

۵۔ تربیت گاہ کا پروگرام

ناظم تربیت گاہ نے اس ادارہ کی مختصر تاریخ اور اس کا موجودہ پروگرام مجلس شوریٰ کے سامنے بیان کیا اور پھر امیر جماعت نے مزید تشریح کی اور اس کے اب تک کے نتائج کو بھی پیش کیا۔

مختلف ارکان شوریٰ نے مختلف مشورے دیے جن کو انشاء اللہ تربیت گاہ کے پروگرام میں ملحوظ رکھا جائے گا۔

۶۔ امیر جماعت کی عدم موجودگی میں نظم جماعت کا مسئلہ

مجلس شوریٰ کے مشورے سے امیر جماعت نے طے کیا کہ ان کی عدم موجودگی میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بطور نائب امیر کے کام کریں گے اور اس دوران میں صرف مرکز ہی میں نہیں بلکہ پوری جماعت میں ان کے اختیارات وہی ہوں گے جو امیر جماعت کے ہیں۔

نوٹ:۔ امیر جماعت کو گذشتہ سال بھر کے یونانی اور ہومیوپیتھک اور دوسرے علاجوں کے باوجود کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ گردے میں پتھری اسی مقدار میں موجود ہے جس مقدار میں نومبر ۱۹۴۵ء میں موجود پائی گئی تھی۔ اب اپریشن کا پختہ ارادہ کر لیا گیا ہے اور وہ اس کی تیاری کے لیے ۱۰ مئی کو شملہ روانہ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خیریت سے واپس لائے۔

(مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ساڑھے بارہ بجے دوپہر ختم ہوا۔)

چوتھا اجلاس

مجلس شوریٰ کا چوتھا اجلاس بعد نماز ظہر تین بجے سہ پہر شروع ہوا اور اس میں حسب ذیل کارروائی ہوئی۔

۷۔ حکومت کی روز افزوں اجتماعی تصرف کی پالیسی پیش نظر

افرادِ جماعت اسلامی کے لیے معاشی لائحہ عمل

اس مسئلے پر غور و فکر اور مفصل گفتگو کے بعد مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ ہندوستان میں حکومت جس رفتار سے صنعتوں اور تجارتوں اور دوسرے وسائل ثروت پر اجتماعی تصرف (Socialisation) قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے اس پر اور اس کے نتائج پر جماعت کی طرف سے امیر جماعت ایک بیان مرتب کر کے شائع کرے، اور جلدی سے جلدی مرکز میں جماعت کے ایسے لوگوں کی ایک کانفرنس (مجلس مشاورت) منعقد کی جائے جو معاشی معاملات میں بصیرت رکھتے ہوں اور یہ رائے قائم کی جائے کہ اس اجتماعی تصرف کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے پہلے تحریک اسلامی کے حامیوں کی آزادیِ حیات اور آزادیِ ضمیر برقرار رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

اگر ضرورت محسوس ہو تو اس مقصد کے لیے جماعت کے ہمدردوں کو بھی مشاورت میں شامل کر لیا جائے۔

۸۔ خطاب عام کا معاملہ

تحریک اسلامی اب اس مرحلے کے قریب پہنچ گئی ہے جہاں اسے عامۃ الناس کو خطاب کرنا ہوگا۔ اس موقع پر جماعت کی صحیح نمائندگی کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کے وہی لوگ خطاب عام کا کام کریں جو اس کے اہل ہوں۔ لہٰذا مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ بیشتر اس کے کہ کسی رکن جماعت کو خطاب عام (خطبہ جمعہ بھی اس میں شامل ہے) کی اجازت دی جائے اس کے متعلق یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ جماعت کی صحیح نمائندگی کر سکتا ہے۔ اس غرض کے لیے حسب ذیل سوالات مرتب کر کے مقامی جماعتوں اور منفرد ارکان کو بھیج دیے جائیں، اور جو لوگ خطاب عام کا بھی کام کرنا چاہتے ہوں یا کرتے ہوں ان سے ان سوالات کا تحریری جواب طلب کیا جائے:-

(۱) کیا آپ تقریر کے ذریعے سے جماعت کے مسلک کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں؟

(۲) کیا آپ تقریر کے دوران میں اپنے موضوع سے ہٹ تو نہیں جاتے؟

(۳) کیا آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ اگر مجمع عام میں جبکہ آپ تقریر کر رہے ہوں، آپ سے کوئی ایسا سوال پوچھا جائے جس کا جواب دینے کی اہلیت آپ میں نہ ہو تو آپ صاف اعتراف کریں کہ آپ اس کا جواب نہیں دے سکتے؟

(۴) کیا آپ میں اتنا تحمل ہے کہ اگر تقریر کے دوران میں آپ پر اشتعال انگیز اعتراضات اور حملوں کی بوچھاڑ کر دی جائے تو اپنے نفس پر قابو رکھ سکیں؟

ان سوالات کے جوابات نہ صرف مقررین سے مانگے جائیں بلکہ مقامی جماعت کے دوسرے ارکان سے بھی دریافت کیا جائے کہ ان کے علم اور تجربے میں ایک مقرر کہاں تک بالا معیار پر پورا اترتا ہے۔

امیر جماعت کے منظور کردہ خطیبوں کا پہلا گروپ میدان میں آجانے کے بعد کسی دوسرے رکن جماعت کو بدوں اجازت امیر جماعت خطاب عام کا حق نہ ہوگا۔

۵۔ ضمنی مراکز کے لیے آبادکاری کے قواعد

امیر جماعت (مجلس شوریٰ) نے اپنے عالم دین رفقاء کے مشورے سے حسب ذیل امور طے کیے:

(۱) جتنے اوقاف ہندوستان کے مختلف حصوں میں جماعت کی اغراض کے لیے کیے جائیں ان سب کے وقف نامہ میں یہ شرط لازماً شامل ہونی چاہیے کہ ان کا متولی امیر جماعت اسلامی بحیثیت عہدہ ہوگا، اور کسی ایسے وقف کو قبول نہ کیا جائے جب تک واقف اس شرط پر راضی نہ ہو۔

(۲) امیر جماعت کو اختیار ہوگا کہ ایسے تمام اوقاف کا انتظام عملاً کسی مقامی جماعت کے سپرد کر دے یا دیگر مقامی جماعت [illegible] یا براہ راست اپنے انتظام میں رکھے۔

(۳) ایسے اوقاف میں عمارات بنانے اور دوسری طرح انھیں استعمال کرنے کے لیے جس کو جو [illegible] باضابطہ شریعت کے قوانین وقف کے ماتحت دی جائے گی

۶۔ تجارتی اداروں کی تنظیم کا مسئلہ

مجلس شوریٰ کے مشورے سے امیر جماعت نے طے کیا کہ تمام جماعتوں اور منفرد ارکان کو ہدایت

بھیجی جائیں کہ وہ اپنے نواح میں جماعت کے ہمدردوں اور متاثرین کی فہرستیں بنائیں اور آئندہ جو جو اصحاب مسلموں یا غیر مسلموں میں سے متاثر ہوتے جائیں یا ارکان کے علم میں آئیں کہ وہ متاثر ہیں ان کے نام بھی نوٹ کیے جاتے رہیں۔

(۱) ان فہرستوں کو ارکان انفرادی طور پر مرتب کرتے رہیں اور وقتاً فوقتاً مقامی جماعت کے امیر کے پاس ان کو یکجا نوٹ کراتے رہیں، پھر مقامی امراء اس مکمل فہرست کو اپنی سہ ماہی رپورٹوں کے ساتھ اپنے حلقے کے قیم کو بھیجا کریں کہ اس سہ ماہی میں کون کون لوگ متاثر ہوئے ہیں یا متاثرین میں سے علم میں آئے ہیں۔

نوٹ: مقامی امراء کی سہ ماہی رپورٹوں سے مراد محرم، ربیع الثانی، رجب اور شوال کی رپورٹیں ہیں۔

(ب) اس امر کی سخت احتیاط ملحوظ رکھی جائے کہ ان ہمدردوں یا متاثرین کو کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا موقع نہ دے دیا جائے کہ جماعت کے نظم میں ان کا کوئی مقام ہے یا جماعت میں داخل ہوئے بغیر محض ہمدردی کا مرتبہ بھی کسی کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

(ج) ارکان اور مقامی امراء فہرستوں میں نام درج کرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی نوٹ کرتے جائیں کہ کوئی شخص کس درجے میں ہمدرد ہے، جماعت کے کام میں کس حد تک اس کی ہمدردی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور اس کے خیالات اور زندگی کس حد تک تحریک سے متاثر ہیں۔

(د) ارکان جماعت کو ان متاثرین کے ساتھ اپنے روابط بڑھانے چاہییں اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان کو جماعت سے قریب تر لائیں، اور ان کے حلقے میں جماعت کی دعوت کو پھیلانے کے لیے ان سے کام لیں۔ وقتاً فوقتاً ان کو اپنی مخصوص اجتماعی ضروریات (مثلاً اجتماعات وغیرہ) میں مدعو بھی کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ عشر کا مسئلہ

مختلف مقامات سے ہمارے پاس یہ سوال آیا ہے کہ جماعت کے دستور العمل کی رو سے ارکان جماعت اپنی زکوٰۃ بیت المال میں داخل کرنے پر مامور ہیں تو کیا زمیندار و کاشتکار ارکان کو اپنی زمینوں کی پیداوار کا عشر بھی بیت المال میں داخل کرنا چاہیے؟ چونکہ ہندوستان کے علماء بالعموم یہ مسلک

رکھتے ہیں کہ یہاں کی زمینیں خراجی ہیں اور یہاں عشر واجب نہیں ہے اس لیے ارکان جماعت اس معاملہ میں مذبذب ہیں۔

مجلس شوریٰ کے انعقاد سے پہلے ہی یہ مسئلہ استصواب رائے کے لیے جماعت کے مختلف علما کے پاس بھیجا گیا تھا اور جو رائیں اس کے جواب میں آئی تھیں وہ سب مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کر دی گئیں۔ اس کے بعد مجلس شوریٰ کے علما ارکان نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ:

کسی غیر اسلامی حکومت کو مالیہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا، لہٰذا جماعت کے جو ارکان زمینیں رکھتے ہیں یا زراعت کا کام کرتے ہیں ان کو اپنی پیداوار کی زکوٰۃ (عشر) بیت المال میں داخل کرنی ہوگی۔

۱۲۔ جماعتی اغراض کے لیے املاک کی خرید و فروخت کے لیے رجسٹری شدہ مجلس (Registered Body) کا قیام

چونکہ ہندوستان میں کوئی جماعت یا انجمن جب تک رجسٹری شدہ جماعت (Registered Body) کی شکل اختیار نہ کرلے کوئی املاک نہ خرید سکتی ہے اور نہ اس کے انتقال کے بارے میں کوئی دوسری کارروائی کرسکتی ہے اس لیے اجلاس کے دوران میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس معاملے پر بھی غور کیا جائے، چونکہ جماعتی کام کی مزید توسیع کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں زمینیں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا کہ جماعت کے معتمد علیہ ارکان کی ایک سوسائٹی (مجلس) اس غرض کے لیے بنادی جائے کہ وہ اپنے آپ کو ایک رجسٹرڈ باڈی کی شکل دے لے۔ اور یہ رجسٹرڈ باڈی اس غرض کے لیے ہو کہ جماعت کی اغراض کے لیے جو زمینیں ہمیں خریدنی پڑیں وہ سب اس باڈی کے نام پر خریدی جائیں۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس تقریباً ساڑھے نو بجے شام ختم ہوا، درمیان میں صرف نماز عصر کے لیے وقفہ کیا گیا۔

ہدایات دربارہ بیت المال

امیر جماعت نے مجلس شوریٰ کے مشورہ سے یہ طے کیا ہے کہ:

(۱) وہ تمام ارکان جماعت جو صاحب نصاب ہوں اپنی زکوٰۃ (عشر کا بھی یہی حکم ہے) لازماً بیت المال میں داخل کریں۔ اگر کوئی شخص اپنی زکوٰۃ اپنے اقارب یا کسی دوسرے مخصوص مستحق فرد یا افراد کو پہلے سے دیتا رہا ہو اور اس کی رائے میں زکوٰۃ وہیں دینا ضروری اور مناسب ہو تو اس کو بھی لازم ہے کہ پہلے اپنی زکوٰۃ بیت المال میں داخل کرے اور پھر مقامی امیر جماعت کو ان مستحقین کی فہرست دے کر خواہ جماعت کے ذریعہ سے یا بیت المال سے مانگ کر خود یہ رقم مستحقین کو پہنچا دے، مگر وہ فہرست دینا امر کی حیثیت سے نہیں ہوگا بلکہ اس کی حیثیت مشورے اور سفارش کی ہوگی۔

(۲) ہر مقام کی جماعت اپنے گردوپیش کی آبادی کا جائزہ لے کر معلوم کرے کہ اس میں زکوٰۃ کے مستحقین کون کون لوگ ہیں، مساکین، یتیم بچے، بیوہ عورتیں، اپاہج اور ایسے بے روزگار لوگ جو کچھ مدد پاکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں ان کی فہرست بنائی جائے، اور ان کو زکوٰۃ پہنچانے کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اگر بیت المال میں زکوٰۃ کی رقوم اس کے لیے کافی ہوں تو باہمی مشورے سے ان لوگوں کے ماہوار وظیفے مقرر کر دیے جائیں ورنہ یکمشت ان میں زکوٰۃ کی رقم تقسیم کر دی جائے، لیکن مسافروں کی اعانت اور غریبوں کی ہنگامی اور وقتی ضروریات مثلاً بیماری، تجہیز و تکفین اور حوادث کی صورت میں مدد کی گنجائش رکھی جائے، نیز زکوٰۃ کی اس تقسیم میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے کہ ہمیں نہ صرف ان لوگوں کی مدد کرنی ہے بلکہ اس مدد کو ان کی اخلاقی اور دینی اصلاح کے لیے بھی استعمال کرنا ہے۔ تقسیم زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھی جائے کہ جن لوگوں کی مدد بیت المال سے کی جائے ان کو شخصی طور پر اپنا ممنون کرنے یا ان پر اپنا ذاتی اثر قائم کرنے کا شائبہ تک ہمارے کارکنوں کی نیتوں میں شامل نہ ہونے پائے اور نہ اصلاح میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے وہ اجرت کی نماز پڑھنے لگیں۔

(۳) زکوٰۃ کی مد سے جماعت کے کام بھی کیے جا سکتے ہیں مثلاً:

(ا) دعوت دین کے سلسلے میں سفر کے مصارف، یا

(ب) غریب لوگوں میں جو ہمارا لٹریچر خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں لٹریچر کی مفت اشاعت، یا

(ج) جو لوگ جماعت کے کام میں اپنا پورا وقت دیتے ہوں ان کے ذاتی مصارف کی کفالت۔

اس سلسلے میں اگر کسی موقعہ پر مزید تفصیلات یا ہدایات کی ضرورت محسوس ہو تو وہ امیر جماعت سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ارکان جماعت کے لیے ضروری ہدایات

(۱) سالانہ اجتماع کی شکل مجلس شوریٰ نے طے کر دی ہے اب حلقے اور جماعت کے سالانہ اجتماع کے لیے مقامات کی تعین کا سوال سامنے ہے۔ ہر حلقے کے قیم صاحبان آپس میں مشورہ کرکے اپنے اپنے حلقے کے سالانہ اجتماع کے لیے مقام کا فیصلہ کرکے دسمبر ۴۶ء سے پہلے پہلے ہمیں مطلع کریں۔

ہمیں یہ اطلاع شمالی ہندوستان کے حلقے سے ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز، ایڈیٹر کوثر، گوالمنڈی لاہور کی معرفت، مشرقی ہندوستان کے حلقے سے چوہدری شفیع احمد صاحب، موضع تھلواڑہ، ڈاکخانہ کمیلا، ضلع بارہ بنکی (یوپی)، کی معرفت، مغربی ہندوستان کے حلقے سے جناب محمد یوسف صدیقی صاحب، نزد مسجد غول محلہ قافلہ ٹونک راج کی معرفت اور جنوبی ہندوستان کے حلقے سے مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری دارالارشاد، علیم آباد، رائے چوٹی، ضلع کڈپہ، صوبہ مدراس کی معرفت آنی چاہیے۔

(۲) جماعت کے کل ہند اجتماع کو ہم مشرقی ہندوستان کے ساتھ ملا کر پٹنہ میں منعقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی مشورہ درکار ہے۔ یہ مشورہ بھی دسمبر سے پہلے پہلے ہمارے پاس پہنچ جانا چاہیے۔

(۳) جماعت کے جو لوگ تقریر یا تحریر کے ذریعے اپنی دعوت کو صحیح طور پر مجمع عام میں پیش کر سکتے ہوں وہ دسمبر ۴۶ء سے پہلے پہلے ہمیں مطلع کریں کہ آیا وہ آئندہ اپنے حلقے یا جماعت کے اجتماع عام میں اپنی دعوت کو کس پہلو سے پیش کر سکیں گے؟ اگر ایسا ہو تو ان کا موضوع کیا ہوگا اور وہ تقریباً کتنا وقت لیں گے۔

اس بارے میں امیر جماعت کو آخر وقت تک ہر قسم کے ردوبدل کا اختیار ہوگا۔

(۴) بیت المال کے سلسلے میں امیر جماعت نے جو ہدایات طے کی ہیں ان کی سختی سے پابندی کی جائے اور تمام بیت المالوں کی تنظیم اُن قواعد کے مطابق کی جائے جو اس بارے میں مجلس شوریٰ نے طے کر دیے ہیں۔ محرم ۶۳ھ کی سالانہ رپوٹوں میں ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مقامی بیت المال کے خازن اور محاسب کون ہیں اور بیت المال کا حساب کیا ہے۔

(۵) بعض قیم صاحبان کو اپنے حلقے کی جماعتوں اور منفرد ارکان سے یہ شکایت ہے کہ ان کے پاس ماہوار رپورٹیں ایسے وقت میں نہیں پہنچتی ہیں کہ وہ اپنی رپورٹ بروقت مرکز میں روانہ کر سکیں، لہٰذا مقامی جماعتوں اور منفرد ارکان کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ نیز خاص حالات میں قیم صاحبان اپنی سہ ماہی رپورٹ محرم، ربیع الثانی، رجب اور شعبان کی بیس تاریخ تک بھی بھیج سکتے ہیں۔

(۶) ہندوستان کے موجودہ حالات اور سیاسی فضا میں مجلس شوریٰ نے ارکان جماعت کے لیے جو طرزِ عمل تجویز کیا ہے اس کی پوری طرح پابندی کی جائے۔

(۷) جماعت کے جو لوگ اس وقت خطاب عام کا کام کر رہے ہیں ان کو چاہیے کہ خطابت عام کے امیدواروں کے لیے مجلس شوریٰ نے جو چار ابتدائی سوالات تجویز کیے ہیں (یہ سوالات مجلس شوریٰ کی روداد میں شق نمبر ۹ کے تحت درج ہیں) ان کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیں اور اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے متعلق یہ محسوس کرے کہ وہ کم سے کم مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا اور نہ ہی اپنی فوری اصلاح پر قادر ہے تو اسے چاہیے کہ اس کام سے احتراز کرے۔

یاد رہے کہ امیر جماعت کے مقرر کردہ خطیبوں (Public Speakers) کا پہلا گروہ موجود ہو جانے کے بعد امیر جماعت سے اجازت لیے بغیر کسی دوسرے شخص کو خطاب عام کا حق نہیں رہے گا۔

مذاکرات، نجی گفتگوؤں یا کسی لکھی ہوئی چیز کو پڑھ کر سنانے پر کوئی پابندی نہیں۔

خاکسار طفیل محمد قیم جماعت اسلامی

مقالات

"صبحِ سمرقند"

(از جناب جیلانی صاحب بی اے)

یہ مفید مضمون کوئی مستقل مقالہ نہیں ہے۔ بلکہ اشتراکیت کی عملی تاریخ سے بحث کرنیوالی ایک تازہ کتاب "صبح سمرقند" (Dawn over Samarkand) کی ایک تلخیص ہے۔ پورے مضمون میں جابجا اس کتاب کی عبارتیں درج ہیں مگر از اول تا آخر مرتب مضمون نے کتاب کا نام کہیں نہیں لکھا۔ اسی کتاب کے عنوان کو اس مضمون کا عنوان بنانے کے لیے مستعار لے لیا گیا ہے۔

اصل کتاب کا مصنف اشتراکیت کا مخالف نہیں کہ اس کی تحریریں کوئی اشتراکی سرمایہ دارانہ پروپگنڈہ کی بو محسوس کر سکے، یہ کسی ایسے نیم حامیٔ اشتراکیت کی تحریر ہے جو اشتراکیت کی تبلیغ کے لیے مصنوعی طور پر ایک منصف مزاج ناقد بنتا ہے اور بہت سی خوبیوں کے ساتھ دو چار کوتاہیاں بھی بیان کر دیتا ہے، بلکہ یہ ایک سچے مومن اشتراکیت امریکی زادیہودی جوشا کیونٹز (Joshua Kunitz) کا نتیجۂ کاوش ہے جو اشتراکیت کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے ہوئے بعض ایسی حقیقتوں کو فاش کر گیا ہے جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام کی کالی رات "جب کسی دیس پر اپنا دامن پھیلاتی ہے تو اس کے کارندے کس طرح کے فنِ تاخت سے کام لیتے ہیں۔ محض "سرخ نظریات" کو کتابوں میں دیکھ کر متاثر ہو جانے والوں کو ان نظریات کی عملی تعبیر سے بھی آگاہ ہونا چاہیے اور درحقیقت یہ عملی تعبیر ہی نظریات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتی ہے۔

خصوصیت سے اس مضمون کو ہم اپنے دیندار علماء کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ زمانۂ حال کی اسلام کی سب سے بڑی حریف قوت کس چابکدستی سے ایک مسلمان ملک کو نگل جاتی ہے اور کس طرح اس ملک کے علماء الحاد کے سیلاب کے سامنے اس وقت تک پڑے سوتے رہتے ہیں جب تک کہ موجیں ان کے سروں سے نہیں گزر جاتیں اور اس کے بعد ان کا چونکنا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم صدق دل سے یہ چاہتے ہیں کہ جن دلوں میں نظام اسلامی کے لیے سچا جذبۂ وفاداری موجود ہے وہ کل کا انتظار نہ کریں اور آج ہی اپنی قوتوں کو منظم کر کے نظام اسلامی کو برپا کرنے میں لگ جائیں ورنہ قضا کا فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد حالات کا رخ بدلنے کی طاقت کس میں ہے! میدان ہار کر لڑنے کی تیاری کرنے کی عادت اب چھوڑ دیجیے اور دنیا پرستی کے ہنگاموں سے الگ ہو کر دین کو غالب کرنے کی جد و جہد کیجیے!

ایشیائے وسطی میں جدیدیت (Modernism) کی پہلی رو ۱۹۰۵ء میں محسوس کی گئی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ روس جاپان سے برسرِ پیکار تھا اور اندرونِ ملک زار کی استبدادی حکومت ایک نئے انقلاب کو جنم دے رہی تھی۔ جدیدیت کے جراثیم لانے والے دراصل والگا کریمیا اور کاکیشیا کے وہ تاتار تھے جو ایشیائے وسطی اور روس کے مسلمانوں کے درمیان بیچ کی کڑی کا کام دے رہے تھے۔ جدیدیت

ابتدا میں محض ایک قانونی اور ثقافتی تحریک کی حیثیت رکھتی تھی جو دنیوی تعلیم اور چند ایک انتظامی اصلاحات کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ روس کے انقلابیوں سے متاثر ہو کر اس نے آہستہ آہستہ اپنے بال و پر نکالنے شروع کیے، پھر قدم بڑھا کر سیاست میں بھی دخیل ہو گئی۔ جدیدیت کے علمبرداروں کا نصب العین اس جمہوری حکومت کے تخیل سے بہت ملتا جلتا ہوا تھا جو اس زمانہ میں ترکی نوجوانوں کے دماغوں میں پرورش پا رہا تھا یہ تحریک چونکہ مذہب سے کوئی علاقہ نہ رکھتی تھی اس وجہ سے اس سے ملحدانہ بو پا کر امیر بخارا نے اس کو دبانے کی کوشش کی۔ تاہم چند درس گاہیں امیر کی داروگیر سے بچ رہیں اور انھوں نے جدید نصاب تعلیم کو قبول کر لیا۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے ساتھ جدیدیت پھر پھوٹ نکلی۔ اور اس کے علمبرداروں نے تعلیم جدید کے لیے از سر نو مطالبات پیش کرنے شروع کر دیے۔ روسی بالشویک، جو اس تحریک کے اصلی بانی تھے، اس وقت اندرونی بغاوتوں کے سدباب میں مشغول تھے اس وجہ سے ان کی کچھ زیادہ مدد نہ کر سکے۔ دوسری طرف روسی سفیر نے، جو دراصل زار کا فرستادہ تھا، قدرتی طور پر ان انقلاب پسندوں کی مخالفت اور امیر کی مدد کی۔ بس یہیں سے کشمکش کا ظہور ہوتا ہے

ہر طرف سے جدید اصلاحات کا مطالبہ ہونے لگا جس سے متاثر ہو کر امیر نے اصلاحات کا ایک منشور شائع کیا جس میں اس نے نئی اصلاحات اور جدید تعلیم کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ فردا ایک سنجیدہ مذاق تصور کیا گیا اور انقلابیوں نے اپنی آواز پھر بلند کی۔ اب کے امیر نے انھیں سختی سے دبایا اور ان کے ایک لیڈر، مرزا نصراللہ کو ایک سو پچاس کوڑے لگوائے جس کی تاب وہ نہ لا سکا اور اسی صدمہ سے مر گیا۔ اس کی موت گویا تودۂ بارود کو آگ دکھانا تھی۔ بہت جلد ہی مرزا کی موت نے ایک انقلابی احتجاج کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ جا بجا ہنگامے اور بلوے شروع ہو گئے اور سربازار انقلابی نعروں کی صدائیں سننے میں آنے لگیں۔ بالآخر امیر اور روسی سفیر نے سربرآوردہ رئیسوں کو بلا کر ان سے بالمشافہ گفتگو کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید پارٹی کے اندر ایک نئی پارٹی نوجوانان بخارا کے نام سے بنائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے لیے حزب مخالف کا کام دے۔ اس نے باقاعدہ حکومت کے کاروبار میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس پارٹی کا ایک باضابطہ لائحہ عمل تھا جس کے ماتحت اس نے سپاہیوں پھر مزدوروں میں کام کرنا شروع کر دیا اور امیر کے خلاف زیادہ سے زیادہ مواد بہم پہنچانے لگی۔

انہی ایام میں روسی انقلاب اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ اور آئے دن بالشویکوں کی فتوحات کی خبریں

سننے میں آ رہی تھیں لیکن ان میں سے کوئی خبر بھی امیر اور دوسرے لیڈروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ وہ اسے مجذوب کی بڑ تصور کرتے رہے۔ لینن کے متعلق یہ افواہ گرم تھی کہ وہ مجنون اور جرمنوں کا معتمد تھا! کمال انقلاب کے دو دن بعد ایک اعلان بعنوان "روس اور مشرق کے بسنے والے مسلمانوں کے نام" موصول ہوا جس کے نیچے لینن اور سٹالن کے دستخط تھے۔ اس میں انھوں نے ان تمام قبائل کو خطاب کیا تھا جن کی مساجد معابد اور مراسم زار روس کے استبداد کی نذر ہو چکے تھے"۔ اس اعلان میں انھوں نے ان مصیبت زدوں کو خوشخبری سنائی تھی کہ اب وہ اپنے مذہب کی پابندی اور مراسم بجا لانے میں بالکل آزاد ہوں گے۔

امیر کی ہمدردی اور حمایت زار نکولس ثانی کے ساتھ تھی کیونکہ اس کے قبل امیر عالم خاں اور زار کے تعلقات نہایت خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ اندرونِ ملک جو پارٹی او وہم مچا رہی تھی اس کو بالشویکوں کی مدد حاصل تھی اس وجہ سے امیر عالم خاں نے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کمر ہمت باندھی۔ امیر نے خفیہ طور پر مجلس شوریٰ بلائی اور ان کے سامنے بالشویکی خطرہ کی وضاحت کی اور اس خطرہ کو دفع کرنے کی ان سے رائیں طلب کیں۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا، دوسری طرف خود سیاسی جماعتوں کے اندر لینن کے "قومی استقلال" کے اعلان پر ایک ناچاتی سی پیدا ہو گئی۔ قومی استقلال کا مفہوم کچھ غیر واضح اور مبہم سا تھا۔ جونہی اس کے معنی کھلے "جدید پارٹی" "نوجوانان بخارا پارٹی" سے الگ ہو گئی۔ قومی استقلال کا مفہوم لینن کے الفاظ میں یہ تھا:

> "خود اختیاری (Self detrmination) سے ہمارا اشارہ اس حق کی طرف ہے جس کی رو سے ایک قوم غیر ملکی قومی مجموعے سے الگ ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی الگ آزاد قومی ریاست تعمیر کرے"۔

اسی مفہوم کو سٹالن نے اور زیادہ واضح کر دیا ہے:

> "اشتراکی جمہوریت تمام ممالک کو خود اختیاری اور استقلال کا پیغام سنا رہی ہے ــــ کسی قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسری قوم کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ اس کے تعلیمی اداروں اور دوسری انجمنوں کو برباد کرے۔ اس کے مراسم آبائی اور رواجوں کو توڑے یا اس کے حقوق تلف کرے"۔
>
> (مارکسزم اور قومی سوال)

ان سب اعلانوں اور بیانوں کے پس پردہ دراصل جو مقصد تھا وہ بورژوا حکومتوں میں انقلاب اور بدامنی پھیلانا تھا۔ اس افتراق میں ایک ائتلاف مضمر تھا۔ استقلال کے معنی اصل میں دوسروں سے ٹوٹ کر روس سے مل جانا تھا۔ کمیونسٹ مینی فسٹو میں مارکس اور اینگلز انقلاب کی اس ترتیب کو لکھتے ہیں:

”ہر ملک کے پرولتاریہ (مزدور طبقہ) کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے اندر بورژوا (امیر طبقہ) سے اپنے حساب کتاب اور دیگر تمام معاملات طے کرلیں۔ اس کے بعد وہ سیاسی قوت کو ہاتھ میں لینے کی سعی کریں حتیٰ کہ وہ ایک جماعت بن جائیں۔ پھر تو وہ ایک قوم ہوں گے۔“

یہ مفہوم تھا جس کو جدید پارٹی نے جلد ہی تاڑ لیا۔ وہ اگرچہ امیر کو تخت سمیت ملک بدر کرنا چاہتے تھے لیکن بالشویکی تسلط پر راضی نہ تھے۔ وہ ملک میں ایک جمہوری قسم کی ریاست بنانا چاہتے تھے جو صحیح معنوں میں ملکی اور قومی ہو۔ اس کے برعکس ”نوجوانانِ بخارا پارٹی“ ایک انتہا پسند جماعت تھی جو بالشویکی انقلاب کی پوری پوری مؤید تھی۔ اس کا نصب العین وہی تھا جو بالشویکوں کا تھا۔ بالشویکوں کی فتنہ پردازی کا قدرتی رد عمل یہ تھا کہ امیر عالم خاں برطانیہ سے مدد طلب کرتا، چنانچہ اس نے برطانیہ کو دعوت دی اور برطانیہ، جو پہلے روز ہی سے حالات کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کر رہا تھا، فوراً راضی ہو گیا۔

بین الاقوامی سیاست میں برطانیہ کی سوداگری اور چالبازی تمام چھوٹے چھوٹے ممالک کو اپنے جال میں جکڑ رہی تھی۔ اور جب تک جاپان نے اس منزل میں قدم نہ رکھا تھا مشرق میں اس کا حریف ایک روس ہی تھا۔ کاکیشیا کے تیل کے چشمے اور ایشیائے وسطیٰ کے سیم و زر کے ذخیرے برطانیہ کے حرص و آز کو بھڑکا رہے تھے۔ دوسری طرف روس بھی اپنا دام تزویر مضبوط طور پر بُن رہا تھا اور دونوں عظیم الشان مملکتیں نبرد آزمائی کے لیے میدان میں اتر رہی تھیں۔ جب برطانیہ افریقہ میں بوئروں کے ساتھ الجھا ہوا تھا، روس نے تبت اور ایران پر اپنا دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا اور جب روس جاپان کے ساتھ سرحدی جنگ لڑنے میں مصروف تھا تو برطانیہ نے بھی اپنا پانسہ پھینک دیا۔ ابھی یہ آنکھ مچولی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ عالمگیر جنگ کی گھٹا اٹھ آئی اور مشترک دشمنی نے دونوں ملکوں کو جوڑ دیا۔

لیکن معاملات کی باگ ڈور جونہی بالشویکوں کے ہاتھ میں آئی انھوں نے ”قومی استقلال“ کا اعلان

کر دیا اور جنگ عالمگیر سے دست کش ہوگئے۔ انھوں نے ایران کے علاقے اس کو واپس کر دیے اور ترکی کا استنبول پر قبضہ تسلیم کرلیا۔ ایشیا میں تیس لاکھ مسلمان اور دیگر اقوام بس رہی تھیں انھیں خود اختیاری حکومت کا وعدہ دیا۔ زار روس کا ہر غصب کردہ مال انھوں نے بلاچون وچرا واپس کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا سلوک کیا ثمر لاتا! برطانیہ کے کان کھڑے ہوگئے اور سب نے منطقی طور پر محسوس کرلیا کہ ایشیائے وسطی کی جنگ میں برطانیہ بالشویکوں کے خلاف صف اول میں کھڑا ہوگا۔

اسی عرصہ میں "نوجوانان بخارا پارٹی" نے ترکستان کی سویٹ کمسرز (Commissers) کے ساتھ سازباز شروع کر دی۔ سویٹ کمسرز کے صدر کولی سف نے اسلحہ اور آدمیوں سے اس کی مدد کا وعدہ کیا۔ اب نوجوانان بخارا پارٹی نے بغاوت برپا کرنے کے لیے سرگرم مساعی شروع کر دیں اور سیاسی قوت کو ہاتھ میں لینے کے لیے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ لیکن شومی قسمت سے انھیں معہود مدد نہ مل سکی اور ان کی محنت سے تیار کی ہوئی عمارت بھرڈھے گئی۔ عین اس وقت جبکہ کولی سف کی فوجیں بخارا کی طرف کوچ کرنے والی تھیں دو ناگہانی حادثے ظہور میں آئے۔ اور وہ حادثے ایسے تھے کہ خود کولی سف اور ترکستانی سویٹ کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا۔ ایک تو مرکزی حکومت ماسکو سے تعلقات کا انتزاع دوسرے کوکند میں غیر بالشویک حکومت کا قیام۔ واقعہ یہ ہوا کہ زار روس کے حامی سائبیریا کے کوسکوں کے ساتھ مل گئے۔ کوسکوں نے اسلحہ اور آدمی بہم پہنچا کر ڈیوٹوف (زار کا حامی جرنیل) کی سرکردگی میں ماسکو سے تاشقند جانے والی سڑک پر قبضہ جما لیا۔ جس کی وجہ سے ترکستان اور ماسکو کے درمیان وسائل رسل و رسائل بالکل قطع ہوگئے۔ ترکستان کی حالت اس کی وجہ سے بڑی زبوں ہوگئی۔ قحط کے آثار نمودار ہونے لگے اور بالشویکوں میں ایک بددلی سی پیدا ہوگئی۔

ادھر کوکند والوں نے جو دیکھا کہ بالشویک اس الجھن میں گرفتار ہیں، انھوں نے فوراً مجتمع ہوکر ایک مقامی جمہوری ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ بالشویکی خطرہ کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ انھوں نے بڑی محنت سے روپیہ فراہم کرکے اپنی ایک فوج بھی بنالی اور اپنے آپ کو زیادہ مضبوط کرنے اور باہمی نزاع کے تمام رخنے بند کرنے کے لیے کوکند کی حکومت نے

عمال مسلمین" کی ایک موتمر بھی منعقد کی۔ انھوں نے ڈیوٹوف سے مدد طلب کی اور اس نے اپنے کوسک ڈویژنوں کو ان کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ کوکند کے بالشویکوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے خفیہ طریقوں سے کوکند کی حکومت کو الٹنے کی کوشش کی۔ یولٹراشکی نامی ایک بالشویک کوکند اسٹیٹ بنک کا تمام روپیہ لے اڑا۔ اس نازک وقت میں علماء آگے بڑھے اور انھوں نے حکومت کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جونہی علماء برسر اقتدار ہوئے بالشویکوں نے چپکے چپکے اندرونی اختلافات کو ہوا دینی شروع کر دی۔ حکومت وقت نے کئی ایک گرفتاریاں کیں۔ اور علماء وقت نے جہاد کا حکم دیدیا۔

"علماء نے بالشویکوں کے خلاف مقدس جنگ کا حکم جاری کر دیا۔ انھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ گلیوں، بازاروں اور مسجدوں میں ان کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ہجوم نے انتہائی غیظ و جوش میں آ کر بالشویکوں کے قلعہ کوگن پر ہلہ بول دیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چاقو، چھرے، لاٹھیاں اور بندوقیں تھیں۔ بالشویکوں نے کوبی سف سے استمداد کی۔ اس کی فوجیں اسی روز ان کی مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ اور لڑائی باقاعدہ شروع ہو گئی۔ کوکند کی حکومت کوکند میں محصور ہو گئی۔ کوبی سف نے شہر حوالہ کرنے اور ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا جو محصورین کی طرف سے نامنظور کر دیا گیا۔ سخت محاربہ کے بعد کوکند کی حکومت کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس طرح مسلمانوں کے سنبھالنے کی یہ کوشش بھی رائگاں گئی۔ تمام علماء اردگرد کے علاقے میں پھیل گئے۔ اور انہدام کے باوجود مسلمانوں کے ٹمٹماتے ہوئے ایمان کو اگر کسی نے کچھ وقت کے لیے بچایا تو وہ یہی علماء تھے۔ انھوں نے اپنی دینی ٹولیاں بنائیں اور گوریلا جنگ جاری کر دی۔

ادھر کوکند حکومت ختم ہوئی ادھر انقلابیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور کوبی سف نے اپنی عنان توجہ بخارا کی طرف موڑ دی۔ کوکند کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی مرکز تھا۔ یہ امیر کا دارالخلافہ بھی تھا اور انگریزوں کی جائے گردآوری بھی۔ امیر بخارا نے فوراً مشہد (ایران) میں مقیم برطانوی سفیر سے سازباز شروع کر دی۔ فتح کے نشے میں کوبی سف امیر کی قوت کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس نے ایک الٹی میٹم امیر بخارا کے نام بھیجا جس میں اس نے طرز حکومت میں فوری اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کیا۔ اس الٹی میٹم کے نیچے

کولی سف اور فیض اللہ خدیو صدر نوجوانان بخارا پارٹی کے دستخط تھے۔ امیر نے جواب دینے میں توقف کیا۔ کولی سف نے انتظار کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی اپنی فوجوں کو بخارا کا محاصرہ کر لینے کا حکم دیا۔ لیکن جس شجاعت اور مردانگی کا ثبوت مسلمانوں نے دیا اس کا حال خود فیض اللہ کی زبانی سنیے:

"قدامت کے مجنون فدائی ملا اپنی بے سروسامانی کے باوجود نہایت دلیری کے ساتھ لڑے۔ ان کے ہاتھوں میں صرف چاقو، کلہاڑے اور زنگ آلود تلواریں تھیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک مسلمان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک سونٹا تھا، دانتوں میں تلوار دبائے وہ بے جھجک مشین گن کی طرف بڑھا اور ایک مشین گن چلانے والے کو مار دیا۔"

بڑے زور کا رن پڑا۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ امیر بخارا نے جدید اصلاحات دینے کا وعدہ کیا اور کولی سف نے اپنی افواج کو شہر کوگن کی طرف لوٹ جانے کا حکم دیدیا۔

اب انقلابیوں نے امیر بخارا کی حکومت الٹ دینے کے لیے ایک اور چال چلی۔ چند دن کی خاموشی کے بعد کولی سف اور نوجوانان بخارا پارٹی نے امیر سے اپنی فوج کو غیر مسلح کر دینے کا مطالبہ کر دیا۔ امیر نے کسی قدر تامل کے بعد جواب دیا کہ اس قسم کے مطالبات موزوں نہیں لہٰذا انھیں ایسے مطالبوں سے دست کش ہونا چاہیے۔ لیکن کولی سف نے پھر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ امیر نے تین دن کی مہلت مانگی۔ کولی سف نے میعاد گھٹا کر آٹھ پہر کر دی۔ میعاد مقررہ کے ختم پر کولی سف نے ایک وفد بھیجا جو اپنے سامنے فوجوں کے ہتھیار رکھوا لے۔ امیر بخارا نے اس مدت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی تمام فوجوں کو منظم کر لیا۔ اور جونہی وفد شہر میں داخل ہوا انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ مسلمانوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ بالشویکوں کی قلعی کھولنی شروع کر دی۔ انھوں نے بلند میناروں پر چڑھ کر ایمان و اسلام اور ملک و قوم کو بچانے کی پکار بلند کی۔ کولی سف اپنی فوجوں سمیت آیا اور بخارا کا محاصرہ کر لیا۔ چوبیس گھنٹے تک گولہ باری ہوتی رہی لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ ایک گولہ بھی شہر پر نہ گرا۔ کولی سف کے بارود کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔

بالشویکوں کی مسلمانوں کو تباہ کرنے کی پہلی کوشش کا یہ انجام ہوا۔

بخارا کی "اسلامی زندگی" چند دن اور باقی تھی۔ انگریزوں نے ایران کی طرف سے بالشویکوں کے خلاف محاذ بنانا شروع کر دیا۔ اور ترکمانستان کے ایک شہر اشک آباد میں بھی ایک بالشویکی دشمن حکومت قائم ہو گئی انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ بالشویکوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری کر دیں۔ اور کئی ایک سربرآوردہ بالشویکی لیڈروں کو قتل بھی کر دیا۔

اس موقعہ پر ترکستانی بالشویکوں کی حالت نہایت پریاس تھی۔ ایک طرف ڈیوٹوف زار کا جرنیل اپنی ترکتازیوں سے ان کی جان کے درپے تھا۔ دوسری طرف اشک آباد کی حکومت ترکمانستان میں ان کا جینا دشوار کر رہی تھی۔ تنگ آکر بالشویکوں نے صلح کا ایک وفد بھیجا۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ اشک آباد کی حکومت نے وفد کے صدر کو قتل کر دیا اور ارکان وفد کو قید خانہ میں ڈال دیا۔

بالشویکوں پر روز بروز عرصہ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ڈیوٹوف ایک کارک کی صورت میں وسطی ایشیا کی بوتل کے منہ پر ڈٹا ہوا تھا اور گندم کا ایک دانہ بھی اندر نہ پہنچنے دیتا تھا۔ کوکند کی حکومت کے وہ مسلمان جنھوں نے ملک وقوم اور اسلام کے لیے اپنی کمر ہمت باندھ کر گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کر لیا تھا، اب از سر نو تازہ دم ہو گئے۔ بالشویکوں کا ایک خاص ہتھیار یہ ہے کہ جب وہ کسی کو بدنام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے نام کے ساتھ بورژوا اور ملوکی چسپاں کر دیتے ہیں، اگرچہ وہ بیچارہ فاقوں ہی مر رہا ہو۔ گوریلا گروہوں کو بھی انھوں نے اسی نام کے ساتھ بدنام کرنا شروع کر دیا، بایں ہمہ دبی زبان سے انھیں ان کی اسلامی حمیت کا جوش تسلیم کرنا پڑا:

"بے شک ترکستان کی قومی حریت کی تحریک کے اندر وحدت اسلامیہ کا جذبہ بھی سرگرم کار تھا۔" (ص۵۳)

نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا ایک تجارتی وفد کرنیل بیلی کی سرکردگی میں ایشیائے وسطیٰ میں پہنچا اور کپاس کا سودا کرنے کے بہانے انھوں نے تمام صورت حالات کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے بالشویکی خطرہ کو سونگھ لیا۔ چنانچہ اس وفد کی رپورٹ میں مسٹر ایتھرٹن لکھتے ہیں کہ "بالشویکوں کے یہ خیالات (Ideas) جنکو لیے ہوئے وہ آ رہے ہیں، زار کی تمام فوجوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔" اس کے بعد تاشقند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہاں بالشویکوں نے ایک تبلیغی مرکز کھول رکھا ہے جہاں سے مبلغ تیار کرکے ہندوستان، افغانستان اور چینی ترکستان میں بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ بالشویکی مذہب شرقِ اقصیٰ تک پھیل جائے۔"

واقعات کی یہ تمام کروٹیں بالشویکوں کے لیے رنج والم کے پیغام لا رہی تھیں۔ اس کے باوجود بالشویکی کارکن اور نوجوانانِ بخارا اپنی تبلیغ واشاعت میں کوشاں رہے اور دامن صبر کو ہاتھ سے نہ دیا۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ تقدیر نے ایک اور پانسہ پھینک دیا۔ افغانستان نے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے ایشیائے وسطیٰ کی تمام سرگرمیوں کو یک قلم ترک کرکے اپنی فوجوں کو ہندوستان کی سرحدوں کی طرف منتقل کر دیا۔ ۱۳ر ستمبر کو سرخ فوجوں نے ڈیوٹوف کی فوجوں پر ایک جان توڑ حملہ کر دیا۔ ڈیوٹوف کی فوجیں حملے کی تاب نہ لاکر پیچھے ہٹ گئیں اور ماسکو اور ترکستان کا درمیانی دروازہ بھی کھل گیا۔

امیر عالم خاں انتہائی گھبراہٹ کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے گوریلا گروہوں کو نئی ترکتازیوں پر ابھارا۔ افغانستان میں امان اللہ خاں کو تحائف بھیجے اور دونوں ملکوں کے درمیان وفود کا تانتا لگ گیا۔ امان اللہ خاں اگرچہ اس ہنگامہ سے فائدہ اٹھاکر اور امیر بخارا کی مدد کرکے وحدت اسلامیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر دیکھنا چاہتا تھا، تاہم بالشویکوں کی دشمنی مول لینے میں وہ بھی بہت محتاط تھا۔ اس کی اس ہچکچاہٹ کو دیکھ کر امیر عالم خاں اس سے ناامید ہوگیا۔

اب سرخ فوجوں نے بخارا کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اور ان کی رہنمائی وہ لوگ کر رہے تھے جو مسلمان کہلاتے تھے۔ خیوا (خارزم)، جو مسلمانوں کا نیا مرکز بنتا جا رہا تھا، مقابلے کے لیے اٹھا لیکن اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ بالشویکی جس طرف رخ کرنا چاہتے ان کے کارندے اس زمین کو پہلے ہموار کر لیتے۔ اور جونہی ان کی فوجیں دندناتی ہوئی داخل ہوتیں تمام علاقہ سرنگوں ہو جاتا۔ یہ تسخیر کی سب سے انوکھی طرز تھی۔ یہی چال تھی جس کے متعلق مسٹر ایتھرٹن نے اشارہ کیا تھا کہ بالشویکوں کے خیالات زار کی تمام فوجوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی شہر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر بالشویکوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ بالشویکی ایجنٹ اس سرعت اور تندہی سے تبلیغ واشاعت میں مصروف کہ ان پڑھ سے ان پڑھ اور جاہل سے جاہل کی زبان

پر بھی کمیونزم، مارکس اور لینن کے نام چڑھ گئے۔

بالشویکی اب بخارا کی طرف ناک اٹھائے بڑھے آ رہے تھے۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں انھیں مقابلہ درپیش تھا۔ حملے سے پہلے انھوں نے عوام کے قلوب پر چھاپا مارنا چاہا۔ روس سے ایک کمیشن ترکستان پہنچا جو عوام کی معاشی اور زرعی حالت پر غور کرے گا۔ انھوں نے ہر ممکن ذریعہ سے کسانوں کی مدد کی۔ انھیں بہترین آلات زراعت بہم پہنچائے اور ان کے آرام اور سہولت کی ہر بات کا خاص خیال رکھا۔ ترکستان کے نواح میں رہنے والے کسان فاقوں مر رہے تھے اور مدت سے انھوں نے لکڑی کے ہل کے سوا اور کوئی آلۂ زراعت ہی نہ دیکھا تھا۔ جب انھوں نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو ایسا کامیاب اور مرفۃ الحال پایا تو انھوں نے اپنی آبائی زمینیں چھوڑ ترکستان کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ بالشویکوں نے اور بھی زیادہ جوش و خروش سے نزدیکی علاقوں کے مفلس باشندوں کی توجہ اس ہوٹل کی طرف کھینچی۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے پرچے پھینکنے شروع کر دیے جن میں لکھا ہوتا:

> "ہم وطن بھائیو! دلیر بنو، انصاف اور قوت تمھاری مدد کے لیے کھڑی ہے۔ خونی زار ملک عدم کو پہنچ چکا ہے۔ اس کے حواری اور خونخوار چیتے ملک بدر کر دیے گئے ہیں۔ اب صرف کسانوں اور مزدوروں کی فوج ہے جو تمھاری ہر آواز پر لبیک کہنے کو ہر وقت تیار بیٹھی ہے۔ زندہ باد روس کے حریت نواز سرخ سپاہی! زندہ باد بخارا کی انقلابی فوج۔"

انقلاب کی خون آشام لہریں بخارا کی فصیلوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ امیر عالم خاں کو اپنا انجام پوری عریانی اور بے بسی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ذاتی خزانے کے بچاؤ کی تدبیر سوچی۔ اور برطانوی سفیر سے درخواست کی کہ وہ اس خزانے کو اپنے ملک میں منتقل کر لے۔ لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اتنی گراں بہا (تیس کروڑ روپیہ) رقم کو حفاظت سے کہیں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا غور کیجیے ایک طرف مال و جان کی بازی لگی ہوئی ہے اور دوسری طرف سب سے پہلے اس کی فکر ہوتی ہے کہ کسی صورت میں سیم و زر بچ جائے۔ ایمان کا اس سے زیادہ انحطاط اور کیا ہو سکتا ہے!

۱۸/ اگست کو کمیونسٹ کارگذاروں کی مجلس منعقد ہوئی جس میں انھوں نے ہجومی حملے کا فیصلہ کیا۔

کئی شہروں کی حکومتوں کے عمال اور ملازمین حکومت کا پانسہ پلٹنے میں ان کی مدد کو تیار رہتے تھے۔ اس طرح بارہ دنوں میں انھوں نے پندرہ سے اوپر شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اور جس جس شہر پر انھوں نے غلبہ پایا، انھوں نے سب سے پہلے علماء اور غیر بالشویکی خیال کے لوگوں کی جائدادیں ضبط کیں۔

آخری ساعت نزدیک پہنچ چکی تھی۔ بخارا کے اردگرد خندقیں کھد چکی تھیں۔ اور مسلمانوں کا یہ مرکز بھی اب بالشوزم کی بھینٹ چڑھا چاہتا تھا۔ بالشویکوں کے مفرط جوش کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محاصرے کے دوران میں ہر روز شہر کے اندر مارکس کی تعلیمات کے پرچے پہنچ جاتے تھے۔ بالشویکی کمر ہمت باندھے تھے اور سرخ فوجیں انقلاب کو ایک کنارے لگانے کے لیے بیقرار کھڑی تھیں۔ بخارا کے محاصرے کا حال ایک عینی شاہد G. Qmeliusty کی زبانی سنیے۔

"تیس اگست کی شام کو بخارا کا محاصرہ کیا گیا۔ بخارا جدید کی گلیاں اس وقت سیاہی اور سکوت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی گھوڑ سوار تیزی سے گذر جاتا یا سرخ گشتی دستے ایک ساتھ قدم ملائے قریب سے نکل جاتے۔ بخارا کے دامن میں کھڑا ہوا ایک شخص باسانی امیر کی گارد کے بلند اور پرجوش نعرے سن سکتا تھا۔ لیکن اس کے باہر بالکل خاموشی تھی۔ اور اس وقت فوجی قانون سے پیدا کردہ سناٹے کو توڑنے والی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ بیرونی سکوت اور اندرونی کشمکش برابر قائم تھے۔ لیکن اس اضطراب کو دیکھنے والا کون تھا جو فوجی اسٹاف اور پارٹی کمیٹی کے اندر تلاطم خیز تھا اور جسے کھڑکیوں کے پردے بیرونی نگاہوں سے چھپا رہے تھے۔ بایں ہمہ اضطراب اور کشمکش چھلک رہی تھی ــــ دو ایک شہروں سے بغاوت اور ہلڑ کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔ باغیوں نے چارجوئی قدیم پر قبضہ کرلیا۔ اور کرکی میں مقابلہ ابھی تک ہو رہا تھا۔ انقلابی دستوں کو شہر کے مفلسوں کی مدد حاصل تھی لیکن وہ مقہور لٹیرے بڑے ہی سخت جان تھے۔

"صورت حال سخت نازک تھی۔ بغاوت کے شعلے اگر اس وقت فرو نہ کیے گئے تو بخارا کا انقلاب ریت کے گھروندے کی طرح کھڑکھڑاتے نیچے آ رہے گا۔ انقلاب کی سختیوں اور منزل کو پانے کے عشق وعزم نے بالشویکوں کو سخت جان اور مضبوط کردار بنا دیا تھا۔ صعوبت کی کوئی بھی گتھی پیش آتی وہ صورت حال

کے ساتھ توافق پیدا کر لیتے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر نواحی مزدور پارٹی کی فوج پہنچ گئی اور انھیں بغاوت کچلنے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

"بخارا پر حملے کی صورت اس طرح تھی کہ ایک دستہ فوج کاگن شہر کی طرف بڑھے (کاگن بخارا کے متصل واقعہ ہے) اور دوسرا ریلوے لائن کے کنارے کنارے جائے۔ حملے کا وقت ٹھیک چار بجے صبح مقرر کیا گیا۔ اور اس وقت تک تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ تجویز یہ تھی کہ دشمن پر اچانک چھاپا مارا جائے اس لیے ہر فعل اور قول انتہائی صیغۂ راز میں رکھا تھا۔

"ٹھیک اس وقت جبکہ گھڑی کی ایک سوئی بارہ پر تھی اور ایک چار پر، توپ نے اپنا پہلا گولہ پھینکا۔ صبح کی نتھری ہوئی فضا گونج سے لرز اٹھی۔ بخارا کے انقلاب نے اپنے آنے کی اطلاع کر دی۔ گولہ ہوا کو چیرتا ہوا مٹی کی اس دیوار پر گرا جس کے پیچھے امیر کی گھوڑ سوار فوج کھڑی تھی۔ یکایک شہر کے شمالی گوشہ سے مشین گنوں نے اپنی گولیاں تڑاتڑ برسانی شروع کر دیں۔ جس کے فوراً بعد ہی رائفلوں کی تچاخ تچاخ سنائی دینے لگی۔ سرخ دستہ اس سیل کی طرح فصیل کی طرف بڑھا جو مدت سے رکا ہوا ہو۔ مقابلہ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ امیر کے دستے مقابلے کی تاب نہ لا سکتے ہوئے بخارا قدیم کی طرف ہٹ گئے۔ کئی توپیں، بندوقیں، بارود کے ذخیرے اور قیدی سرخ فوج کے ہاتھ لگے۔ بخارا قدیم اور کاگن (بخارا جدید) کا درمیانی فاصلہ بھی چند لمحوں میں عبور کر لیا گیا۔ اور دوپہر کے قریب ہماری چند ٹولیاں بخارا قدیم کے مضافات میں لڑ رہی تھیں۔

"شہر پناہ کی بلند و عظیم دیواریں سامنے کھڑی تھیں۔ وہ اس جگہ پوری چھ صدیوں سے کھڑی تھیں۔ وہ سطح ارض سے ستر فٹ بلند تھیں اور ان کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ ہمارے گولے ان پر بالکل بے اثر ثابت ہوئے۔ ان دیو قامت دیواروں کے پیچھے دشمن (مسلمان) بالکل محفوظ و مامون تھا۔ بایں ہمہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر ٹی جائیں۔ دشمن پر دیواروں کی اہمیت پوری طرح واضح تھی اور وہ اپنے آپ کو حملے کے لیے پوری طرح سے تیار کر رہا تھا۔ انھوں نے شہر کا ایک ایک بچہ فوج میں بھرتی کر لیا۔

ہاتھوں میں قرآن تھامے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے ملا چلا رہے تھے "خدا ان جدیدوں کو غارت کرے"۔ اور فصیل کے باہر سے نعرہ بلند ہوتا "انقلاب زندہ باد"۔

شہر کی دیوار میدان معرکہ بن گئی تھی۔ بار ہا سرخ سپاہی بلہ بول کر اوپر چڑھ گئے لیکن گولیوں کی ایک تند بوچھاڑ ان کا منہ پھیر دیتی۔ دیوار کے قریب ایک قبرستان تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں کئی ہاتھ بدل چکا تھا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ شہر کے دروازے کھول دیے گئے لیکن "ملا" اور عوام "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا کر توپوں کے دہانوں میں گھس جاتے۔

"امیر نے اپنی گھوڑسوار فوج لے کر ہماری جنگ کا نقشہ بدلنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ دوبارہ ہم نے شہر کے قارقلی دروازے میں داخل ہونا چاہا لیکن امیر کے سخت جان دیوانے سپاہی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ اور ہمیں اپنے مردوں کو بھی چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔ وہ رات اور دوسرا دن برابر لڑائی میں گذر گیا۔ اور لڑائی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ تھمی۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر آسمان کو چھو رہے تھے۔ اور رات کی سیاہی کے اندر توپوں کی گرج، مشین گنوں کی کرخت تڑتڑ، زخمیوں کی چیخ پکار ایک قیامت کا سا منظر پیدا کر رہی تھیں۔

"ہمارے سپاہیوں کی صفیں خالی ہو رہی تھیں۔ اور ہمارے کئی محبوب دوست اس نبرد میں اپنی جانیں انقلاب کی دیوی کی نذر کر چکے تھے۔ ہمارا بارود کا ذخیرہ اب ختم ہو رہا تھا لیکن دشمن بدستور مقابلہ پر ڈٹا ہوا تھا۔ پھر تیسرا دن بھی یونہی گذر گیا۔ رات کو لڑائی کچھ وقت کے لیے رک گئی لیکن زیادہ شدت کے ساتھ جاری ہونے کے لیے۔ اب ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال ایک بلبلے کی شکل میں ابھر رہا تھا، اگر ہم نے تیسرا دن بھی یونہی ضائع کر دیا اور محصورین نے ہمیں قدم ہٹانے پر مجبور کر دیا تو پھر بخارا ہمارے ہاتھوں سے کئی برسوں کے لیے نکل جائے گا۔ اور ہمارے دشمنوں کی ہمت پھر جوان ہو جائے گی۔

"ہم نے ایک آخری سر دھڑ کی بازی لگائی اور اس شدت سے حملہ کیا کہ ہم نے اپنے بڑے قیمتی جرنیلوں کی جانیں بھی اس میں لگا دیں۔ ہم نے توپوں کو دیواروں کے عین قریب نصب کر دیا۔ اور اس زور سے گولہ باری کی کہ دیواروں میں شگاف ہو گیا۔ ہماری صفوں سے خوشی کا ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ ہمارے دو جانباز دستے شگاف کے راستے شہر میں داخل ہو گئے۔ اب گلیوں کے اندر دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ ہمارے دستے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ گلیوں میں مکانوں کے

اوپر سے کھولتے پانی کے دھارے گرے، دستی بم برسے، گولیوں کی بارش ہوئی لیکن ہم نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

"ہم بڑھتے ہوئے شہر کے شمالی گوشے میں پہنچ گئے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے دشمن بالکل تھک گیا تھا۔ اور جب ہمیں وہ دستہ بھی مل گیا جس کو ریلوے لائن کے راستے داخل ہونا تھا تو لڑائی بالکل ہی ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اطلاع ملی کہ امیر بخارا اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا۔"

۴ مارچ ۱۹۲۱ء کو بخارا کی حکومت سوویٹ ری پبلک آف بخارا بن گئی۔ ارکان حکومت سب مقامی تھے۔ معاہدہ کی رو سے بخارا کی سویٹ، روس کی سویٹ فیڈریشن سے منسلک ہو گئی۔ دونوں ری پبلکوں نے ایک دوسرے کی مدد کا عہد کر لیا جس کے ایفا کے لیے روس کی طرف سے فوری اقدام اٹھایا گیا۔ اور بخارا کے لیے اپنے انجنیئر، استری، کانیں مہیا کرنے والے ماہرین، سوداگر اور تجارت کو فروغ دینے والے بیوپاری، فوجی تربیت دینے والے سپہ سالار، اسکول ماسٹر مع جدید نصاب تعلیم، زبان و ادب کے ماہر اور پریس بھیج دیے۔ اللہ کے فضل سے اب بخارا ترقی کی نئی شاہراہ پر گیٹ گامزن تھا۔

اب ذرا حکومت کی سن لیجیے۔ سب سے پہلے بالشویکوں نے علما، اور بالشوزم کے مخالف مسلمانوں کی جائدادیں ضبط کیں، پھر ان کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کیا۔ زمین کی خرید فروخت کا معاملہ حکومت نے اپنے اختیار میں لے لیا۔ اور روس کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کیے گئے۔

حکومت کے ارکان منتخب ہو گئے۔ سویٹ (مجلس شوریٰ) بن گئی۔ اب فکر ہوئی کہ جس انقلاب کے نام پر ساری تباہی و غارت گری ہوئی اس کو کیوں کر معرض عمل میں لایا جائے۔ مختلف ادارے سرگرم ہو گئیں۔ اشتراکیت کا حسین تصور اب حقیقت کی کسوٹی پر آیا۔ اب سوشلزم کے معانی پھوٹنے لگے اور ان کی تشریحیں اور تفسیریں پھیلنے لگیں۔ مارکس کا ایک فقرہ جو اس نے "تنقید سیاسی اقتصادیات" کے دیباچہ میں لکھا تھا ہر کمیونسٹ کی زبان پر چڑھ گیا۔

"کوئی مجلسی نظام اس وقت تک معدوم نہیں ہوتا جب تک کہ تمام پیداواری قوتیں اپنے نقطہ کمال تک نشو نما پا جائیں۔ اور پیداوار کی نئی قوتیں اس وقت تک ظہور میں نہیں آتیں جب تک کہ ان کی

زیست کے مادی اسباب پرانے نظام کے رحم میں پرورش پانا شروع نہ کر دیں۔"
تاریخ کا یہ اٹل قانون جو مارکس کے قلم سے ٹپک گیا تھا بھلا کمیونسٹ بیچاروں کی کیا مجال کہ ٹلا سکتے یا بدل سکتے۔ ان کے نزدیک حقیقت وہی ہے جو مارکس کہہ گیا ہے۔ اب بڑی دقت پیش آئی۔ بخارا کے حالات میں ان شروط و اسباب کا ہلکا سا سراغ بھی نہ ملتا تھا۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے۔ "امیر کے ماتحت بخارا اپنے ابتدائی دور سرمایہ داری میں تھا۔" (۱۲۰ ص) یہ دیکھ کر کچھ کمیونسٹ کھسکنے شروع ہو گئے۔ بالشویکوں نے فوراً خلیفہ اول لینن کا یہ بیان پڑھ کر سنا دیا:

"آپ کہیں گے کہ نہیں اشتراکیت کے انعقاد کے لیے تمدن کی ایک خاص حالت ضروری ہے۔ بہت خوب! پھر ہم تمدن کی وہ خاص حالت پیدا کرنے کے لیے کیوں نہ جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کو نیست و نابود کر دیں، اور اشتراکیت کی طرف بڑھ جائیں۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ اس قسم کی ترمیم تاریخی نظام یا قانون میں ناقابل تردید یا ناممکن ہے۔"

کسانوں اور مزدوروں کا وہ طبقہ جو انقلابیوں کے ساتھ مل کر انقلاب کو لایا۔ اس بات کا خواہاں تھا کہ زمین کی تقسیم کے وہ خواب جو بالشویکوں نے انھیں دکھائے تھے پورے ہوں۔ لیکن یہ خیال حقیقت کا جامہ نہ پہن سکا۔

"بہت سی مساعی ناکام رہیں ـــــ عوام ایک ایسا زرعی انقلاب دیکھنے کے لیے تڑپ رہے تھے جس میں تمام زمینوں کو غریب طبقہ میں بانٹ دیا جاتا۔ اشتراکیت کے خواب کی یہی تعبیر ان کے لیے باعثِ اطمینان ہو سکتی تھی۔ لیکن انقلاب کی پیچیدہ صورت اور انقلابی لیڈروں کی کم فہمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس خیال کو بالکل ترک کر دیا گیا ـــ حتیٰ کہ وہ پروگرام جو آغاز عہد میں سوچا گیا تھا وہ بھی محض قرطاس ہی پر اپنی جگہ پا سکا۔" (۲۳ ص)

چنانچہ ۱۸ اگست ۱۹۲۲ء کو جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے بیع و شرا کی کھلم کھلا اجازت دے دی گئی اور سویٹ بخارا میں لوگ جائداد کو اس طرح لے دے سکتے تھے جس طرح اس سے قبل وہ "بورژوا" حکومت میں کرتے تھے۔

نظریے اور عمل کا یہ خلا پھر بھرا نہ جا سکا۔ اشتراکیوں کے وہ نعرے جو بخارا کی فصیلوں کے نیچے گونجتے تھے اب ایک گنبد کی آواز بن کر رہ گئے۔ محمد خدیو، عثمان خدیو اور عارف بڑے سرگرم اشتراکی اور حکومت کے رکن تھے، یہ صورت حال دیکھ کر بد دل ہوگئے۔ ان کا بد دل ہونا تھا کہ ان پر فوراً غداری کا الزام لگا کر مجرم قرار دے دیا گیا۔

۱۹۲۱ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد چودہ ہزار تھی۔ ۱۹۲۲ء میں گھٹ کر دس ہزار رہ گئی جو آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے ایک ہزار تک پہنچ گئی۔

ضعف ایمان کے باوجود مسلمانوں پر روز بروز الحاد و زندقہ کا بڑھتا ہوا طوفان زیادہ واضح ہوتا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بلا جرم ضعیفی کی پاداش میں ان پر نازل ہوئی تھی لیکن جب وہ آئی تو جن کے سینے میں حبۃ خردل کے برابر بھی ایمان تھا اس کا آخری دم تک مقابلہ کرتے رہے۔ بخارا کی نئی حکومت کا بننا تھا کہ علماء نے زور شور سے اپنی تبلیغ جاری کر دی۔ انھوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ لیں اور بخارا کے اردگرد گوریلا جنگ جاری کر دی۔ انھوں نے نواحی علاقوں کے تمام قبائل میں بےچینی اور تڑپ پیدا کر دی۔ تمام قبائل نے متحد ہو کر بالشوزم کے مقابلے کی ٹھان لی۔ ابراہیم بیک جو ایک مشہور دلیر اور جری جوان تھا، ان کا رہنما بن گیا۔ اب آئے دن بخارا اور اس کے قریبی علاقوں پر حملے ہونے لگے۔ ان ترکتازیوں نے ان کی ایسی دھاک بٹھا دی کہ وسطی ایشیا کے تمام وہ قبیلے جو ابھی تک بڑھتی ہوئی بالشویکی قوت کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے، دلیر ہوگئے۔ اور ان علماء اور مسلمان گوریلا گروہوں کی مدد پر کمربستہ ہوگئے۔

امیر عالم خاں بخارا سے سیدھا افغانستان پہنچا جہاں اس نے مسلمانوں کی حالت کا پورا نقشہ ان کے سامنے پیش کر کے وہاں کے لوگوں سے ان بے یار و مددگار مسلمانوں کی مدد کے لیے اپیل کی اور زندقہ کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب سے آگاہ کیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جونہی افغان عوام پر اصل حالات کھلے وہ گوریلا گروہوں کی یلغاروں میں شامل ہونے کے لیے پہنچنے لگے یہاں تک کہ سرخ فوج سے ان لوگوں نے دو ایک شہر بھی واپس لے لیے۔

سقوط بخارا کے بعد تاجکستان کے مسلمانوں نے بڑا شور و غوغا بلند کیا۔ بخارا کے نواحی علاقوں میں غم و غصہ کی ایک لہر پھیل گئی۔ انہی دنوں خوش قسمتی سے مشہور ترکی لیڈر انور پاشا گوریلا گروہوں کی قیادت کے لیے آن موجود ہوا۔ ترکی انقلاب کے بعد جب انور پاشا نے مصطفےٰ کمال کو اپنا ایک جانی دشمن پایا اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت نے اس کو میدان سیاست سے کنارہ کشی پر مجبور کر دیا تو انور پاشا وہاں سے جرمنی آگیا۔ جب اس جگہ بھی اس کو سکون نہ ملا تو ماسکو پہنچا۔ بالشویک انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ انور پاشا اس انگریز دشمنی میں بالشویکوں کا ہمنوا تھا۔ چنانچہ باکو کی موتمر میں اس نے بالشویک ہمت کی داد دی۔ سوشلزم کی تعریف اور انگریزی ملوکیت کی مذمت کی۔ لیکن انور پاشا کی اس حمایت پر بالشویکوں کو اعتماد نہ ہوا۔ ترکی کی طرف سے انور پاشا نے دست رفاقت بڑھایا لیکن اس کی زوال پذیر قوت بالشویکی حکومت کی نظروں میں کچھ وقعت نہ حاصل کر سکی۔ ان کے لیے صرف مصطفےٰ کمال کے وعدے ہی کچھ باعث اطمینان اور دقیع ہو سکتے تھے۔ جب مصطفےٰ کمال نے ان کی طرف دوستی کی سنگینیں بڑھائیں تو انھوں نے اس کے ایما پر انور پاشا پر کڑی نگرانی بٹھا دی۔ انور پاشا کی پوزیشن بڑی نازک تھی۔ وہ اپنا وقار کھو چکا تھا جو کسی حکومت کی پشت پناہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ترکی اب "جوانان ترکی" کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ اب اس غریب کے پاس کیا دھرا تھا؟ لیکن اس کے باوجود انور پاشا کے جلال، اس کا عزم اور اس کی باغیانہ ہیبت سب کے دلوں پر طاری تھی۔ اس نے سوشلزم کی تائید شروع کر دی جس سے بالشویک پھر سوچ میں پڑ گئے۔ اس نے بخارا میں قیام کرنے کی خواہش ظاہر کی اور وہاں جا کر سوشلزم کے حق میں ایک آدھ بیان بھی دیدیے اور تقریر بھی کر دی۔ اس سے بالشویک کچھ اسقدر مطمئن ہو گئے کہ بخارا کی حکومت نے اس کو سرخ فوج منظم کرنے کی پیشکش کر دی۔ انور پاشا نے اس پیشکش کو منظور کر لیا۔

اس دوران میں اس نے دردمند مسلمانوں کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی اسے ایک مسلمان بالشویک لیڈر مل گیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی بخارا ری پبلک کی مرکزی مجلس عاملہ کا صدر عثمان خدیو چھ سو سپاہیوں سمیت اس کے ساتھ مل گیا۔

موقعہ پاکر انور پاشا بخارا سے فرار ہو کر تاجکستان پہنچ گیا جو گوریلا گروہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

عثمان خدیو بھی اپنی فوج سمیت آن ملا۔ وہاں سے انھوں نے ایک منشور شائع کیا جس میں انھوں نے بالشویکوں کی اسلام دشمنی اچھی طرح آشکارا کی۔ اس اعلان کے بعد وبے ہوئے مسلمان بھی باہر نکل آئے اور جوق در جوق انور پاشا کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ مسلمان روز بروز لامذہبیت کی طرف لڑھکتے چلے جارہے تھے۔ طلائی تکلیوں کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک مذہب اپنی سچائی کسی انسانی جماعت کی صورت میں ظاہر نہیں کرتا اس وقت تک عامۃ الناس مطمئن بھی نہیں ہوتے۔ محض قرطاس کے اوپر لکھی ہوئی سچائی کو صدق دل سے ماننے والے اور اس سے مطمئن ہونے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اسلام حق تھا لیکن اس کو اپنے اعمال کی تصویر میں اتارنے والے لوگ نہیں تھے۔ بالشوزم محض جھوٹ تھا۔ لیکن اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے والے موجود تھے۔

انور پاشا نے بالشویکوں سے ایک شہر بھی خالی کروالیا۔ پھر انور پاشا اور ان لوگوں نے جو بالشوزم سے منحرف ہوچکے تھے، بخارا کے کمیونسٹ مسلمانوں کے نام ایک خط لکھا۔

"ہمارا سلام قبول ہو۔ خدا کے فضل وکرم سے ہم خیریت سے ہیں۔ آپ کا بے معنی خط ملا۔ آپ کی عنایت کا شکریہ۔ اپنے خط میں آپ نے تحریر کیا ہے۔ "آغاز تحریک ہی سے آپ نے انقلاب بخارا کے لیے تمام مساعی وقف کردی تھیں، اور ہم اس وقت جب کہ ہم آپ کو اس خدمت کے صلے میں ایک بہت بڑا فوجی عہدہ پیش کرنے والے تھے کہ آپ غیر ذمہ دار لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ہمیں چھوڑ گئے۔ پھر لوٹ آیئے۔ آپ کی تمام خطائیں معاف کردی جائیں گی۔" آپ کی ایسی نظر عنایت واقعی حیرت کن ہے۔ لیکن ہمیں بتایئے۔ کیا یہ آپ لوگ ہی نہ تھے جنھوں نے روس کے بالشویکوں کی مدد سے سرزمین بخارا کو تاخت کیا، بے گناہ انسانوں کے خون کی ندیاں بہادیں اور ان کے ہاتھوں سے بچا کھچا مال و متاع بھی چھین لیا؟ کیا یہ آپ ہی نہ تھے جنھوں نے ہمارے مقدس مقامات، مسجدیں اور مدرسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے، اور ہمارے مفلس لوگوں کو لوٹ، زردار اور جاگیردار بیکار گردان کی زندگیاں اور جائدادیں لوٹ لیں، اور کیا یہ آپ ہی نہ تھے جنھوں نے اپنے دین کو ترک کیا اور بالشوزم (کمیونزم) اختیار

کو قبول کیا؟

محض روٹی کے ٹکڑے کے لیے تم نے ملعون روسیوں کے ہاتھوں اپنا دین، اپنا ایمان، اور اپنا ضمیر فروخت کر دیا۔ تم آزادی اور حریت کے پرچم لہراتے ہوئے آئے اور بخارا کی فصیلوں پر چڑھ گئے اب بتاؤ وہ آزادی کہاں ہے؟ بخارا پر ادبار و خلاکت کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ فاقہ و افلاس کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ اس حقیقت حال کو دیکھ کر عثمان خدیو۔ جو تمھاری مجلس عاملہ کا صدر اور انقلاب کا روح رواں تھا منقلب ہو گیا۔ وہ اس جھوٹے جوئے کو اپنی گردن پر اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں چونکہ اپنی مادر وطن کا فرزند ہوں ملک کی ترقی اور مفاد کے لیے لڑتا رہا ہوں اور آئندہ بھی لڑوں گا حتی کہ روسی بالشویکوں اور تمھارے جیسے غداروں سے وطن کی مقدس سرزمین پاک کر دوں۔

بخارائے عظیم کا ایک فرزند بھی جو اپنی قوم کا صحیح بہی خواہ ہے تمھارے مکروہ خیالات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، اپنی عزت اور ضمیر بیچنے کو تیار نہیں۔

آج ہماری آنکھیں بخارا کے ڈیڑھ لاکھ انسانوں کو شہر پناہوں کے اندر اور پہاڑوں کی وادیوں میں اپنی شمشیریں جھنکارتے اور دشمنان ملت سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ اے کمیونسٹو! ہم اپنے ملک کے سچے فرزندوں کے پہلو بہ پہلو لڑیں گے حریت اور ترقی کے لیے۔ ہم بھرتی کے سپاہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں خدام قوم ہیں۔ ہم اپنے ملک کو عنقریب روس سے گلو خلاصی دلانے والے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ہمارا مسلک اور عقیدہ سچا ہے اور ہمارا نصب العین خالص ہے۔ اطراف و اطراف سے اس وقت مسلمان ہتھیار بند ہو کر ہماری مدد کو آ رہے ہیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کو نجات دلائی جائے...... اگر تم اسلام کے سپاہی بننا چاہتے ہو تو ان روسیوں کو مادر وطن سے نکالنے میں ہمارا ساتھ دو۔ بس ہماری یہی خواہش ہے۔"

انور پاشا نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تمام قبائل کو جس لڑی میں پرو دیا تھا، افسوس کہ وہ اس میں منسلک نہ رہ سکے۔ وقتی جوش و خروش بغیر سیرت کے کچھ نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ اندرونی خلفشار اور رقابتیں پھر ابھرنے لگیں۔ ابراہیم بیگ، جو انور پاشا کی آمد سے قبل گوریلا گروہوں کا قائد تھا، انور پاشا کے خلاف

ڈہرا گلنے لگا۔ اس نے ایران کے ساتھ ساز باز شروع کر دی اور انور پاشا کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ اگرچہ امیر عالم خاں ابراہیم بیگ کو بار بار انور پاشا کی اطاعت کی تلقین کرتے لیکن بالآخر خود اس کا دل بھی ڈانواں ڈول ہو گیا۔ پھر ابراہیم نے فوجوں میں بددلی اور بدنظمی پھیلانی چاہی تو انور پاشا نے اسے پانچ دن تک قید میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ وہ معافی مانگنے پر مجبور ہو گیا۔

ادھر بالشویکی ان گوریلا گروہوں میں بدنظمی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کام کو سرانجام دینے میں وامے درمے سخنے ہر صورت کوشش کی۔ ان کی بیرونی سازشیں اس لیے کامیاب نہ ہو سکیں کہ انور پاشا اس میدان کا شاہسوار تھا۔ مگر داخلی بدنظمی اور تفرقہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ابراہیم اپنی فوجیں لے کر سوکائی آ گیا جہاں اس نے بڑی آزادی کے ساتھ انور پاشا کے کام میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔ ایک اور بڑا سردار حنیف اللہ بھی الگ ہو گیا۔ اب انور پاشا تھا اور سرخ فوجوں کا دباؤ۔ اس نے اپنی باقی ماندہ قوت جمع کی اور افغانستان کی سرحد کے قریب ڈیرے ڈال دیے تاکہ اگر کسی وقت اعانت کی احتیاج ہو تو ادھر سے مل سکے۔

۴ اگست ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ بالجوان اور خوزلنگ کی پہاڑیوں کی درمیانی وادی میں انور پاشا ایک بڑے اجتماع میں تقریر کر رہا تھا کہ سرخ فوجوں کا ایک دستہ اس کی تلاش میں وہاں پہنچ گیا۔ اب سوائے لڑائی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک خونریز جنگ چھڑ گئی۔ انور پاشا اور اس کے ساتھی بڑی جانبازی سے لڑتے مارے گئے۔ انور پاشا کے ہتھیار اور وردی اب تک تاشقند کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں لیکن اس کی پکار گم ہے۔

(باقی)

رسائل ومسائل

رسموں کی شریعت

سوال:- چند اشکال درپیش ہیں۔ ان کے متعلق شرعی رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے۔

ا۔ ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہشمند ہے، یعنی شادی بڑے تزک و احتشام سے کرکے وقتی سی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رہنمائی کیسے کی جائے؟

ب۔ ایک مقروض مسلمان جو تمام اثاثہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، بیٹے بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سامنے آتی ہیں جو بہر حال صرفِ کثیر چاہتی ہیں تو اس کے لیے کیا راہ عمل ہے؟

ج۔ عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو، چنانچہ اسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو طے کرکے بڑھاپے کی سرحد میں جا داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں۔ اس معاملہ میں اسلام کیا کہتا ہے؟

د۔ موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چِلّہ، باجہ، منگنی، جہیز اور اسی طرح چالیسواں، قل وغیرہ کی جو رسوم انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

جواب:- ا۔ ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے، اور پھر محض دنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے گڑھے میں پھینک رہا ہے۔ اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی

قرض لے گا، یا کسی ہمدرد کی جیب پر ڈاکہ ڈالے گا، اور اگر اسے قرض حسن مل گیا جس کی امید نہیں ہے، تو اسے مار کھائے گا، اور اس سلسلہ میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنی بے ایمانی اس سے سرزد ہو گی۔ آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جا سکتا ہے جو محض اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے بڑے گناہ جانتے بوجھتے اپنے سر لے رہا ہے۔

ب۔ ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کرنی چاہیئں جو مالی حیثیت سے اسی جیسے ہوں اور جو اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں پھیلائیں اور نہ دوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلانے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

ج۔ یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے۔ لیکن اس کو حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور اسے کوئی مناسب لڑکا نظر آئے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے میں ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابۂ کرام میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی ذلت کی بات ہوتی تو نبی صلعم اس کو منع فرما دیتے۔

د۔ یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں، ان میں پھنس کر ان کی زندگی آپ تنگ ہوئی جا رہی ہے، لیکن لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان کو کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہ راست ان رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن اور سنت کی پیروی کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقہ پر لوگ آجائیں تو بڑی خرابیاں بھی دور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

سوال:- میں عرصہ سے تجرد کی زندگی گذار رہا ہوں اور اس سب کی ذمہ داری میرے "اجتناد" کے سر ہے۔ ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارہ میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو ان کو "ناجائز" اور "غیر شرعی رسم" کہنا مشکل ہو گا۔ مثلاً یہ کہ منسوبہ یا منکوحہ کے لیے زیور و پارچہ جات کا مطالبہ، کچھ آپس کے لین دین، ایک دوسرے کے کمینوں

اور خدمت گاروں کو بطور عطیہ و انعام کچھ دینا دلانا، برادری اور اہل قرابت کو بلانا اور ان کی ضیافت کرنا وغیرہ، بہت سی چیزیں بظاہر اگر علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھی جائیں تو ان میں سے غالباً کسی ایک کو بھی ناجائز نہ کہا جا سکے گا۔ لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ان کی پابندی اور التزام اس حد تک ہے کہ ان کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کسی درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو، ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز کر ہی نہیں سکتا تو بالکل صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف "مباح" کے درجہ پر باقی نہیں رہی ہیں، بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گویا مجرم متصور ہوتا ہے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر باطل قانون کو توڑ دیا جائے، چاہے وہ کہیں ہو، تو سوال یہ ہے کہ آیا مذکورہ بالا چیزیں اس شکست و ریخت کی مستحق ہیں یا نہیں؟ اگر یہ حملہ کی مستحق ہیں، جیسا کہ میری رائے ہے، تو کیا یہ حقیقت آپ سے مخفی ہے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کی "شریعت رسوم" نافذ العمل نہ ہو، خواہ اس کی تفصیلی اشکال کچھ ہی ہوں۔ جن تقریبات کو آج کل "شرعی تقریبات" بھی کہا جاتا ہے وہ بھی بس صرف اس حد تک "شرعی" ہوتی ہیں کہ ان میں ناچ، باجہ گاجہ اور ایسی ہی دوسری خرافات مزخرفات نہیں ہوتیں۔ لیکن مذکورہ بالا رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں بھی بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں اور انھیں "اباحت" کی چادر میں چھپا لیا جاتا ہے۔ پس کیا "مرکز" کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے ارکین کو "غیر شرعی رسوم" کی وضاحت اس طرح کر کے بتلائے کہ یہ "اباحت" کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل مسنون طریقہ پر منائیں؟

اگر ان رسوم کے خلاف میرا احساس صحیح نہ ہو تو پھر کچھ وضاحت سے "شریعت رسوم" کے واجبات کو قابل بغاوت قوانین باطل سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجوہ تحریر فرمائیں۔ اس سے اگر میرا اطمینان ہو گیا تو تجرد کی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکے گی۔ اور اگر آپ نے میری رائے کی تصدیق کی تو پھر میرے لیے بظاہر کامیابی کا کہیں موقع نہیں ہے، مگر مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی، کیونکہ پھر یہ تکلیف صحیح معنوں میں اللہ کی راہ میں ہوگی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

جواب: ہم "الاقدم فالاقدم" کے اصول پر کام کر رہے ہیں۔ پہلے دین کی جڑوں کو دلوں میں جمانا ضروری ہے، اس کے بعد تفصیلات کو ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں اور کونوں میں درست کرنے کا موقع آئے گا۔ اگر ہم شادی بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات و جزئیات بیان کرنے پر اتر آئیں تو ہماری اصولی دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں تک دین کے بنیادی امور کا تعلق ہے ہم ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے ان کے متعلق ہم سردست اجمال سے کام لے رہے ہیں۔

شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلہ پر پہنچ جائے جہاں ان چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پر اصرار کرنا چاہیے جن کو صریحاً خلاف شریعت کہا جا سکتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرت اسلامی کی روح کے تو خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون و شریعت بنی ہوئی ہیں تو وہ ہمارے ذوقِ اسلامی پر خواہ کتنی ہی گراں ہوں، لیکن سردست ہمیں ان کو اس امید پر گوارا کر لینا چاہیے کہ بتدریج ان کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا کرنا رضامندی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ احتجاج اور فہمائش کے ساتھ ہو یعنی ہر ایسے موقع پر یہ واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اُس طرح کے نکاح چاہتی ہے جیسے ازواجِ مطہرات اور دوسرے صحابہ کرام کے ہوئے تھے، لیکن اگر تم لوگ یہ تکلفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے کہ جب تم نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کی طرح کے سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو!

ہمارا یہ رویہ تو اپنے حلقہ سے باہر کے لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی امور میں معاملہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن خود اپنے حلقہ کے اندر ایسے جتنے روابط اور معاملات رونما ہوں، انھیں رسوم کی آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی اس سطح پر لے آنا چاہیے جس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے انھیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں

مباحات کو، مباحات ہی کی حد تک رہنا چاہیے اور ان میں سے کسی چیز کو قانون اور شریعت کے درجہ تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ رواج کی رو میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر پہل کی جسارت نہیں کر سکتے۔ رسموں کی بیڑیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انھیں کاٹنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اپنی پیٹھوں پر لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمریں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں مگر ان کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے معاملات اور تقریبات کو گوناں گوں پابندیوں سے آزاد کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے۔ اور لوگوں کی "ناک" بچانے کے لیے خود نکو بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو کسی نہ کسی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے۔

سوال: ہمارے علاقہ میں عام طور پر نکاح کا مہر نوصد روپیہ معین ہوتا ہے۔ اس میں سے تین سو روپیہ کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور چھ سو روپیہ کی رقم وصول طلب رہتی ہے۔ لیکن بالعموم مرد کی طرف سے اس چھ سو کی ادائیگی کی نوبت کبھی نہیں آتی۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کا نکاح آج سے قریباً سال قبل ہوا تھا اور اس کا مہر دس ہزار روپیہ قرار پایا تھا۔ لڑکے کی طرف سے اول اول اتنے بڑے مہر کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہوتا رہا مگر آخرکار محض اس وجہ سے یہ ہٹ چھوڑ دی گئی کہ یہ سب کچھ ایک نمائشی رسم کے سوا کچھ نہیں۔

اب اسی رشتہ دار کی دوسری لڑکی کی نسبت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ طے پائی ہے اور اب جلد ہی اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ لڑکی کے اولیا کی طرف سے قبل از وقت یہ اطلاع پہنچائی گئی ہے کہ مہر وہی نو دس ہزار روپیہ مقرر ہوگا۔ اگر اس رقم میں اب کوئی کمی کی جائے تو ان کا پہلا داماد بگڑ جائے گا کہ جب اس کے لیے دس ہزار روپیہ مہر رکھا گیا تھا تو اب دوسرے داماد سے کوئی امتیازی رویہ کیوں اختیار کیا جائے؟

اس الجھن کو طرفین نے حل کرنے کی صورت یہ سوچی ہے کہ مجلس نکاح میں جب کہ ہمارے عزیز کا پہلا داماد موجود ہوگا، مہر وہی نو دس ہزار روپیہ تحریر کیا جائے گا، مگر بعد میں خفیہ طور پر اس تحریر کو بدل کر نو ہزار سے نو سو کر دیا جائے گا۔ اس طرح نہ پہلا داماد ناراض ہوگا نہ ہمارے چھوٹے بھائی پر بار رہے گا!

مجھے اس مجوزہ صورتِ معاملہ میں کھٹک سی ہو رہی ہے اور میں نے اس کا اظہار اپنے والد محترم کے سامنے بھی کر دیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ علمائے شریعت سے استصواب کرلیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا ہے کہ ایک مقامی مفتی صاحب سے استفتا کیا جا چکا ہے اور ان کی رائے میں ایسے معاملہ میں طرفین جب راضی ہیں تو شریعت معترض نہیں ہو سکتی۔ اس پر میں نے والد صاحب پر اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا ہے۔

یہی معاملہ جماعت اسلامی کے ایک رکن کے سامنے رکھا تو انھوں نے فرمایا کہ مجوزہ صورت معاملہ میں ایک تو پہلے داماد کو فریب دیا جائے گا اور دوسرے دس ہزار مہر کی بہرحال ایک اور مثال عوام کے سامنے قائم کی جائے گی اور رسم و رواج کی بیڑیوں میں گویا ایک اور کڑی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس وجہ سے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا۔

اب مشکل یہ ہے کہ نکاح کی مجلس میں لڑکے کا بھائی ہونے کی وجہ سے مجھے شریک بھی ہونا ہے اور شاید وکیل یا گواہ بھی بننا پڑے، اور صورت ایسی ہے کہ میرا ضمیر اس کے جائز ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔ اگر میں بہ حیثیت وکیل یا شاہد مجلس میں شریک ہوتا ہوں تو خود اس غلطی میں حصہ دار ہوں جس کو سوچ سمجھ کر میرے عزیز کرنے لگے ہیں۔ اگر شرکت سے باز رہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ میں بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہوں نیز اگر عدم شرکت کی وجہ مجھ سے پوچھی جائے تو میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں، کیونکہ اگر حقیقت بیان کر دوں تو سارا معاملہ درہم برہم ہو کے رہے گا۔

اب براہ کرم آپ میرے لیے صحیح اسلامی رویہ تجویز فرما دیں۔ انشاءاللہ میں دنیوی تعلقات اور مفاد کو تعمیل میں حائل نہ ہونے دوں گا۔ میں صرف شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اتباع

برنباہ ہوں، قرار کے لیے کوئی تاویل مجھے مطلوب نہیں ہے۔

جواب:- جو معاملہ آپ نے لکھا ہے وہ ایک نمونہ ہے ان غلط کاریوں کا جن میں مسلمان شریعت و اخلاق سے دور ہو کر مبتلا ہو گئے ہیں۔ شریعت نے مہر کو عورت کا ایک حق مقرر کیا تھا اور اس کے لیے یہ طریقہ طے کیا تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان جتنی رقم طے ہو اس کا ادا کرنا مرد پر واجب ہے۔ لیکن مسلمانوں نے شریعت کے اس طریقے کو بدل کر مہر کو ایک رسمی اور دکھاوے کی چیز بنا لیا، اور بڑے بڑے مہر دکھاوے کے لیے باندھنے شروع کیے، جن کے ادا کرنے کی ابتدا ہی سے نیت نہیں ہوتی اور جو خاندانی نزاع کی صورت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بلائے جان بن جاتے ہیں۔ اب ان غلطیوں سے بچنے کی سیدھی اور صاف صورت یہ ہے کہ مہر اتنے ہی باندھے جائیں جن کے ادا کرنے کی نیت ہو اور جن کے ادا کرنے پر شوہر قادر ہو۔ پورا مہر بروقت ادا کر دیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس کے لیے ایک مدت کی قرارداد ہونی چاہیے اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کر دینا چاہیے۔ اس راستی کے طریقہ کو چھوڑ کر اگر کسی قسم کے حیلے نکالے جائیں گے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ ایک غلطی سے بچنے کے لیے دس قسم کی اور غلطیاں کی جائیں گی جو شرع کی نگاہ میں بہت بری اور اخلاق کے اعتبار سے بنہایت بدنما ہیں۔ آپ ایسے نکاح میں وکیل یا گواہ کی حیثیت قبول نہ کریں، بلکہ فریقین کو سمجھانے کی کوشش کریں اور اگر نہ مانیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ نکاح میں شریک ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جھوٹ اور فریب کا گواہ بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔

شریعتِ اسلامی کی اسپرٹ

سوال:- ہمارے مقامی خطیب صاحب نے ایک وعظ میں یہ فرمایا ہے کہ اگر کسی ملک میں جبراً گاؤ کشی بند کر دی جائے تو اس صورت میں ملک کے مسلمان باشندوں پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکم امتناعی کی خلاف ورزی کریں۔ یہ فتویٰ مجھے کچھ عجیب و غریب سا معلوم ہوتا ہے۔ آخر شریعت نے جن چیزوں کو حلال ٹھیرایا ہے وہ سب حلال ہی تو ہیں، واجب کیسے ہو گئیں، مثلاً اونٹ کا گوشت کھانا حلال ہے۔ لیکن اگر کوئی اسے نہ کھائے تو وہ مجرم نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حلت کے معنی وجوب کے نہیں ہیں۔ آپ فرمائیے

کہ مذکورہ بالا فتویٰ کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: - یہ بات تو بہت صحیح ہے کہ جب کسی مباح چیز کو کوئی حکومت یا کوئی طاقت زبردستی حرام قرار دے دے تو اس کی قائم کی ہوئی حرمت کو تسلیم کرنا گناہ ہے اور اس کو توڑ دینا واجب ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جو حضرات چھوٹے چھوٹے مباحات کے معاملہ میں شریعت کے اس حکم سے واقف ہیں، ان کو یہ یاد کیوں نہیں آتا کہ جس نظام حکومت میں وہ رہتے ہیں اس نے حرام و حلال قرار دینے کے پورے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور نماز روزہ اور نکاح و طلاق کے چند مسائل کو چھوڑ کر خدا کی پوری شریعت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اگر گاؤکشی کی ممانعت پر گاؤکشی مباح کے بجائے فرض ہو جاتی ہے تو پوری شریعت کی تنسیخ پر کیا کچھ فرض ہو جاتا ہوگا ــــــ یہ ان مولوی صاحب سے پوچھیے!

شریعت اسلامی کی یہ ایک مستقل اسپرٹ ہے کہ وہ زندگی میں اپنا پورا غلبہ بلاشرکت غیرے چاہتی ہے اور اگر غیر اللہ کا کوئی اقتدار انسانوں پر اپنا دامن پھیلانا چاہتا ہے تو وہ اپنے متبعین کو اس کا باغی دیکھنا چاہتی ہے، نہ کہ مطیع و وفا شعار! جس نظام حق کو گائے کی قربانی جیسے معمولی مسئلہ میں غیر اللہ کی مداخلت گوارا نہیں ہے، وہ آخر اسے کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ سیاست اور معیشت اور معاشرت کے اہم مسائل میں خدا سے سرکشی کرنے والی کوئی قوت اپنی مرضی کو اللہ کے بندوں پر نافذ کرے۔

شریعت اسلامی کی یہی اسپرٹ ہمیشہ نظام کفر و جاہلیت کے خلاف ارباب حق کو صف آرا کرتی رہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشینگوئی پوری ہوتی رہی ہے کہ میری امت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا، نہ کسی ظالم کا ظلم۔ یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدید اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خرافات کے آگے جھک جانے سے روکا ہے۔

مگر جہاں یہ اسپرٹ مسلمانوں میں کمزور ہو گئی ہے وہاں انھوں نے اپنی اسلامیت میں کتر بیونت کر کے ہر قسم کے نظام ہائے طاغوت کو نہ صرف یہ کہ گوارا کر لیا ہے، بلکہ حد یہ کہ اسے چلانے اور مستحکم رکھنے اور اس کا تحفظ کرنے کی خدمات تک سر انجام دینے کے لیے تیار ہیں۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ گاؤکشی اگر طاغوت کی روک سے مباح کے بجائے واجب

ہو جاتی ہے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کا قائم کرنا جو پہلے ہی فرض اور بہت بڑا فرض ہے باطل کی طرف سے کسی مزاحمت کے پیدا ہو جانے پر دین کے ہر فرض سے بڑا فرض ہو جاتا ہے اور اس سے چشم پوشی کر کے اگر مسلمان ہزار نفلی عبادتیں بھی کرے تو وہ بے معنی ہیں۔

درحقیقت کسی غیر الٰہی طاقت کی مداخلت فی الدین چاہے کتنے ہی چھوٹے معاملہ میں ہو مسلمان کے عقیدۂ توحید پر براہ راست ضرب لگاتی ہے اور ہر ایسی مداخلت کے معنی یہ ہیں کہ مداخلت کرنے والے نے ایک خاص معاملہ میں اپنی خدائی کا عملی اعلان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان پر مسلمان کا امن و سکون سے بیٹھے رہنا تک اس کے ایمان کو مشتبہ کر دیتا ہے، اکجا یہ حال کہ اس اعلان کے اعلانچی خود مسلمان ہوں بلکہ دوسروں سے بالجبر اسے منوانے کے لیے اپنی قوتیں باطل کے ہاتھ فروخت کریں۔

پس اصلی مسئلہ قربانی گاؤ کا نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا سوال ہے اور اس کی حفاظت میں کوتاہی کر کے ہم کس اخروی بہبود کی امیدیں قائم کر سکتے ہیں!

گذارش

جو حضرات جماعت اسلامی کے بیت المال یا مکتبہ جماعت اسلامی یا دفتر ترجمان القرآن کو اپنی رقمیں بینک کے چیک کی صورت میں بھیجتے ہیں ان سے التماس ہے کہ براہِ کرم منی آرڈر یا بیمہ کی صورت میں بھیجا کریں۔ کیونکہ ہمارے کسی دفتر کا حساب بینک میں نہیں ہے اور چیک بھنانے میں ہم کو بہت زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔

"ناظم بیت المال"

مطبوعات

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔

شائع کردہ :- دارالاشاعت نشأۃ ثانیہ، جدید ملے پلی، حیدرآباد دکن۔ صفحات ۱۸۲۔ قیمت مجلد ۳؎

ہندوستان کی "مسلم تاریخ" میں حقیقی اسلام کی روح پہلی مرتبہ مجدد الف ثانی کا قالب اختیار کرتی ہے اور پھر یہی روح شاہ ولی اللہ دہلوی کے سینے میں پل کر "سید شہید" بنتی ہے، جس کے قلب سے تحریک اسلامی کی جوئے نور بہ نکلی۔ اگر ہندوستان کی مسلم تاریخ میں مجاہدین کے خون سے لکھا ہوا یہ باب شامل نہ ہوتا تو دنیوی سیاست کی یہ ساری داستان مدت العمر ہمیں شرسار رکھنے والی تھی۔ مگر اس داستان کا حال وہی ہوا کہ

اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

واقعات کی کچھ مہریں شہادت گاہ بالاکوٹ کے ذروں پر ثبت تھیں، حوادث کے کچھ نقوش طاغوتی عدالتوں کے ریکارڈ میں مدفون تھے، جہاد حق کے کچھ یادگار نامے بعض دیندار علمی گھرانوں کے پاس محفوظ تھے اور رہی سہی خبریں برطانوی پروپگنڈا بازوں کے ہتھے چڑھیں جنھوں نے ان خبروں کو سیاسی مصلحتوں کے خراد پر چھیل چھال کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اس مواد کو کھنگالنے اور تحقیق کی چھلنی سے چھاننے کے کام سے مسلسل تغافل ہوتا رہا، کیونکہ حکومت تو اس "ذہنی زہر" سے مسلمانوں کو بچانا ہی چاہتی تھی، خود مسلمان بھی کافرانہ طرز سیاست کو اختیار کر لینے کی وجہ سے ایک خالص اسلامی تحریک میں کوئی وجہ دلچسپی نہیں پا رہے تھے۔

آخر کار ندوہ کے دو طالب علموں نے تاریخی جواہرات کے اس خزانے کو کھود نکالنے اور مسلمانوں کے سامنے لا رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں ایک عرصہ لگ گیا اور بہت ہی موزوں وقت پر دونوں اصحاب کے نتائج تحقیق دامن امت کی زینت ہیں۔ میری مراد ایک تو مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی اور ان کی تالیف "سیرت سید احمد شہید" اور دوسرے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور ان کی پیش نظر کتاب

"ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" سے ہے۔

دونوں اصحاب نے میدان کار کو تقسیم کر لیا تھا، یعنی علی میاں نے آغازِ دعوت سے چل کر شہادت گاہ بالاکوٹ تک کے مراحل کا بیان اپنے ذمہ لیا اور مولانا مسعود صاحب نے بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد کے احوال کی چھان بین فرمائی ہے۔ علی میاں اپنی کتاب میں محض ایک دردمند مخلص مبلغ کی حیثیت میں نمودار ہوئے ہیں اور زیادہ تر ثبت معلومات پیش کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مسعود بیک وقت مبلغ بھی ہیں اور محقق بھی، یعنی ایک طرف وہ انگریز اہل قلم کے پروپگنڈوں اور غلط فہمیوں کی محققانہ تردید کر کے اور حقیقتوں کو نکھار کر سامنے لاتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مبلغانہ جذبات کو اپنی تحریر میں سمو کر قلب و نظر کو تحریک دلانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔ اس کام میں جتنی عرق ریزی اور پتہ ماری کی گئی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ صرف انہی کو ہو سکتا ہے!

اس کتاب میں تحریک جہاد کی تنظیم، راہ حق کے مصائب، مخالفین کی سرگرمیاں، نظام کفر کی زیادتیاں اور اپنوں کی ستم ظریفیاں، سبھی کچھ کم از کم اس حد تک سامنے آگیا ہے جس حد تک آج کے علمبردارانِ تحریک اقامت دین کو اپنی پیش رو تحریک جہاد کے متعلق جاننا چاہیے۔ ماضی قریب میں وادی حق میں اقدام کرنے والوں کے مبارک نقوش قدم ہمارے سامنے رکھ دیے گئے ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے ہم کتاب و سنت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا صحیح نہج معلوم کر سکتے ہیں۔

بحمد اللہ کہ مولف کا قلم کسی انسانی عقیدت سے مسحور نہیں ہے کہ اشخاص کے اسوہ کو وہ اسوہ رسول کی طرح تنقید سے بالاتر قرار دے، بلکہ جا بجا ان انسانی لغزشوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں جن پر کسی نہ کسی حد تک تحریک جہاد کے اس طبعی انجام کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے، جس کا سامنا مجاہدین کو کرنا پڑا۔ مورخ اگر اس نامطبوع فریضہ سے چشم پوشی کر جائے تو تاریخ سے صحیح استفادہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

"وہابیت" کی اصطلاح کی توضیح کر کے جناب مولف نے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ اصطلاح محض اس غرض سے گھڑی گئی ہے کہ تحریک اسلامی کا راستہ روکنے کا کام دے اور جب کسی داعی حق کا منہ بند کرنے کے لیے محکم دلائل مزاحمین کے پاس نہ رہیں تو اسے وہابی کہہ کر مسلمانوں کا مبغوض

بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس ایجاد نے اپنا مقصد بہت خوبی سے پورا کیا ہے۔ لیکن اب جب کہ اقامت دین کا کام پھر آغاز کیا جا رہا ہے، یہ ایک اچھی پیش بندی ہے کہ "وہابیت" کی حقیقت کھول کر دشمن کے ہاتھ سے لکڑی کی یہ تلوار بھی چھین لی گئی ہے۔

جناب مولف نے جس حق کا احقاق کتاب میں کیا ہے، بحمد اللہ کہ وہ عملاً اسی حق کے مخلص علمبردار ہیں اور اس وجہ سے یہ مختصر سی کتاب ان ذخائر علمی پر بھاری ہے جن کے مؤلفین و مصنفین اگرچہ قلم کے بادشاہ ہیں، مگر اپنے ہی پیش کردہ حق کا اتباع کرنے سے سب سے پہلے خود ہی گریزاں ہیں۔

کتاب میں اغلاط کی اتنی کثرت ہے کہ صفحوں کا تو اغلاط نامہ ہی شریک اشاعت ہے اور اس چیز نے خود مولف کے ذوق کو بہت مجروح کیا ہے، مگر مجبوری!

معین الفرائض مرتبہ جناب مفتی محمود حسن صاحب اجمیری، مدرس اول جامعہ حسینیہ راندیر (سورت)

جناب مولف سے طلب کریں۔ قیمت : ۸؍

علم میراث پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں متعلقہ اصطلاحات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے اور تقسیم ترکہ کے اصول اور فروع بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس علم کی اپنی ایک مستقل ریاضی ہے اور مولف نے اسے بھی اچھی طرح اپنی مختصر کتاب میں سمیٹ لیا ہے۔ ایسی کتابیں ان لوگوں کی نگاہ سے ضرور گذرنی چاہییں جو شریعت کے قانون وراثت کو اپنی اور دوسروں کی زندگیوں میں عملاً جاری کرنا چاہتے ہیں۔ نیز اپنے بچوں کو بھی اس ضروری علم اور اس سے تعلق رکھنے والی ریاضی سے ہر مسلمان کو واقف کرنا چاہیے۔ جو لوگ وراثت اور زکوٰۃ کی ریاضی کے بجائے اپنے بچوں کو سود کی ریاضی سکھانے میں مصروف ہیں، وہ خدا کو کیا جواب دیں گے؟

منشور اقوام متحدہ از جناب محمد حمید اللہ صاحب، استاذ قانون جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:- حیدری گشتی کتب خانہ، رسالہ عبد اللہ، نظام شاہی روڈ، حیدرآباد، دکن۔

بے خدا تہذیب کے بنائے ہوئے نظام زندگی میں ایک ایسا خلا پایا جاتا ہے جسے پر کرنے میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ افراد کی ہدایت اور نگرانی کے لیے حکومت کا ادارہ کافی ہوگا، پھر حکومتوں کی بدعنوانیاں دیکھ کر جمہور قوم کو ان کا نگراں بنایا گیا۔ اس پر معلوم ہوا کہ جمہور کا اجتماعی ذہن اور کیرکٹر بھی کسی بھروسے کے قابل

نہیں، یہاں پہنچ کر ایک بین الاقوامی اقتدار کی ضرورت محسوس ہوئی اور پہلی جنگ عظیم نے جمعیت اقوام کو جنم دیا، مگر یہ تجربہ بھی بہت ہی مایوس کن نکلا۔ عین ممکن تھا کہ انسان اس موقع پر بے خدا زندگی سے بددل ہو جائے مگر طاغوتی طاقتوں نے ڈھارس بندھا کر اسے پھر ایک تجربہ پر آمادہ کرایا اور اقوام متحدہ کا ادارہ تشکیل پذیر ہوا اس ادارہ کا منشور تجربی علوم اور الحادی فکر کا آخری نچوڑ ہے! اسی منشور کا ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے!

جو لوگ بے خدا زندگی سے مطمئن ہیں ان کے لیے تو اس منشور میں دلچسپی ہے ہی، لیکن ہماری رائے میں حکومت الٰہیہ کے مبلغوں کو بھی اس کا مطالعہ غور و فکر سے ساتھ کرنا چاہیے، کیونکہ آج یہودیت اور نصرانیت اور مجوسیت ان کی حریف طاقتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کی ساری ٹکر دین الحاد سے ہے۔ اور کسی طاقت سے ٹکر لینے والوں کو ہر پہلو سے اس کا خوب اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیے۔

یہ پورا منشور اپنے بودے پن پر خود سب سے بڑا گواہ ہے اور اس کا لفظ لفظ یہ شہادت دے رہا ہے کہ الٰہی ہدایت سے بے نیاز عقل ایک گرہ کھولنے میں دس نئی گرہیں ڈال دیتی ہے۔ اقوام متحدہ کو دنیا کا نگراں بنانے والوں کو اس سوال کا جواب اول قدم پر دینا چاہیے کہ خود اقوام متحدہ کی راست روی کا ضامن کون ہے؟ لیکن اس سوال کا کوئی جواب کس کے پاس نہیں ہے؟

اس منشور کا مطالعہ علمی ذوق رکھنے والے اصحاب ہی کریں، عوام کے لیے اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے!

درسگاہ رسول کے ۲ طالب علم

از جناب اعجاز الحق صاحب قدوسی۔

شائع کردہ:- مکتبہ قدوسی، نام پلی اے (۱۱۷) جدید لال ٹیکری۔ حیدر آباد، دکن۔ قیمت عہ

مسجد نبوی کا دار العلوم جس کا دار الاقامہ "صفہ" (چبوترہ) تھا، کیسے کیسے امامانِ زمانہ تیار کرتا رہا ہے، اس کی تفصیل تاریخ اسلام سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس دار العلوم کے دو طالب علموں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے سبق آموز زمانۂ تعلیم کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ضروری حد تک دونوں کی سیرت بھی بیان کی گئی ہے۔ یہ مختصر کتاب بچوں اور بڑوں سبھی کے لیے دلچسپ اور مفید ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مُسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مُسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مُسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصّہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے، اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے، ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور اِن اصُولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۱-۴-۰-۰ حصہ دوم ۲-۸-۰-۰ حصہ سوم ۱-۱۲-۰-۰

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور پٹھانکوٹ (پنجاب)